

آئینہ ادب

AAINA-E-ADAB

برائے بارہویں جماعت



بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان، اجمیر
ek/; fed f'k{kk ckM] jktLFkku] vtej

آئینہ ادب

AAINA-E-ADAB

برائے بارہویں جماعت
FOR CLASS XII



بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان، اجمیر
ek/; fed f'k{k kM] jktLFkku] vtej

آئینہ ادب

AAINA-E-ADAB

برائے بارہویں جماعت
FOR CLASS XII

مرتبین

ڈاکٹر قاید علی خاں

Dr. Qaid Ali Khan
Associate Professor
Deptt. of Urdu
S.P.C. Govt. College, Ajmer

ڈاکٹر فیروز بیگ (کنوینر)

Dr. Firoz Baig
Associate Professor (Convener)
Deptt. of Urdu
S.P.C. Govt. College, Ajmer

ڈاکٹر شاہد الحق چشتی

Dr. Shahidul Haque Chishty
(Principal)
Govt. Adarsh Higher Secondary School
Gagwana (Ajmer)

ڈاکٹر معین الدین شاہین

Dr. Moinuddin 'Shaheen'
Associate Professor
P.G. Deptt. of Urdu
Govt. Dungar College, Bikaner

ہیرالال

Hira Lal
(Lecturer Urdu)
Govt. Adarsh Sr. Sec. School, Mohangarh,
Jaisalmer



بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان، اجمیر
ek/; fed f'k{kk ckM] jktLFkku] vtej

کمیٹی برائے اردو نصاب

- ۱۔ ڈاکٹر معین الدین شاہین (کنوینز)
گورنمنٹ ڈونگر کالج، بیکانیر
- ۲۔ ڈاکٹر شاہد الحق چشتی
گورنمنٹ آدرش ہائر سیکنڈری اسکول، گگوانہ (اجمیر)
- ۳۔ محمد صادق
گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول، رامسر (اجمیر)
- ۴۔ ڈاکٹر صولت علی خاں
ایس۔ پی۔ سی۔ گورنمنٹ کالج، اجمیر
- ۵۔ ڈاکٹر خورشید جہاں نقوی
یونیورسٹی آف راجستھان، جے پور

کمپٹی برائے ترتیبِ درسی کتاب

کتاب : آئینہ ادب AAINA-E-ADAB

برائے بارہویں جماعت
FOR CLASS XII

کنوینر

ڈاکٹر فیروز بیگ

Dr. Firoz Baig

Associate Professor (Convener)
Deptt. of Urdu, S.P.C. Govt. College, Ajmer

اراکین

ڈاکٹر قائد علی خاں

Dr. Qaid Ali Khan

Associate Professor
Deptt. of Urdu, S.P.C. Govt. College, Ajmer

ڈاکٹر معین الدین شاہین

Dr. Moinuddin 'Shaheen'

Associate Professor
P.G. Deptt. of Urdu
Govt. Dungar College, Bikaner

ڈاکٹر شاہد الحق چشتی

Dr. Shahidul Haque Chishty

(Principal)

Govt. Adarsh Higher Secondary School, Gagwana (Ajmer)

ہیرالال

Hira Lal

(Lecturer Urdu)
Govt. Adarsh Sr. Sec. School, Mohangarh, Jaisalmer

عہد (ifrKk)

بھارت میرا دلش ہے۔ سبھی بھارتی میرے بھائی بہن ہیں۔ میں اپنے دلش سے محبت کرتا/کرتی ہوں۔ مجھے اس کے کثیر اور گونا گوں سرمایے پر فخر ہے۔ میں اس کے لائق ہونے کے لیے ہمیشہ کوشش کرتا رہوں گا/کرتی رہوں گی۔

میں اپنے والدین، استاذہ اور سبھی بزرگوں کی عزت کروں گا/کروں گی۔ اور ہر شخص کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤں گا/آؤں گی۔

میں اپنے دلش اور دلش کے باشندوں کے تئیں وفادار رہنے کا عہد کرتا/کرتی ہوں۔

میری خوشی صرف ان کی خوشحالی اور بہبودی میں ہی ہے۔

دولفظ

طالب علم کے لیے درسی کتاب منظم مطالعے اور مبصرانہ صلاحیت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ مواد اور طریقہ تعلیم کی رو سے درسی کتاب کے معیار کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ درسی کتب کو دقیق (مشکل) اور محض مدح و قدح کی مثال نہیں بنانا چاہیے۔ درسی کتاب آج بھی درس و تدریس اور طریقہ تعلیم کا ضروری اور اہم ذریعہ ہے۔ جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

گذشتہ کچھ برسوں سے مادھیمک شکشا بورڈ، راجستھان کے نصاب میں لسانی اور تہذیبی اقدار کی نمائندگی کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ تاہم صوبائی حکومت نے نویں جماعت سے بارہویں جماعت تک کے طلباء و طالبات کے لیے بذریعہ مادھیمک شکشا بورڈ راجستھان، اپنا نصاب مرتب کر کے نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسی کے مطابق بورڈ نے درسی کتب، تسلیم شدہ نصاب کے مطابق تیار کرائی ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتب طلباء و طالبات میں فکر و تدبیر اور اظہار خیال کی صلاحیت کے روشن مواقع فراہم کریں گی۔

پروفیسر بی۔ ایل۔ چودھری

صدر

مادھیمک شکشا بورڈ راجستھان اجمیر

پیش لفظ

زیر نظر کتاب ”آئینہ ادب“ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان ، اجمیر کی بارہویں جماعت کے لیے، تسلیم شدہ اردو نصاب کے مطابق مرتب کی گئی ہے۔ اس کتاب کو مرتب کرتے وقت ان تمام ضروری نکات اور امور کو ملحوظ رکھا گیا ہے جن کا تعلق تعلیم اور طالب علم سے ہوتا ہے۔ کتاب میں ایسے اسباق اور تخلیقات کو شامل کیا گیا ہے جن میں ہندوستانی تہذیب، تمدن اور صالح اقدار کی جھلک دکھائی دے۔ قومی یکجہتی کے جذبے کو تقویت دینے کی غرض سے اردو کے مسلم اور غیر مسلم شعرا و ادبا کی تخلیقات کو یکساں طور پر شامل کیا گیا ہے۔ طلباء کے معیار کا لحاظ رکھتے ہوئے مشکل الفاظ اور بوجھل تحریروں سے حتی الامکان گریز کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اسباق و تخلیقات کے ذریعہ طلباء میں وسعت مطالعہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسباق و تخلیقات میں تنوع، توازن اور اعتدال قائم کرنے کی غرض سے موضوعات کی تکرار سے گریز و پرہیز کیا گیا ہے۔ ہر تخلیق اور مضمون کے آخر میں مشکل الفاظ کے معنی تحریر کیے گئے ہیں تاکہ طلباء کو معنی کی تلاش میں دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے۔

تمام اسباق کے آخر میں بالترتیب مختصر ترین، مختصر اور تفصیلی سوالات شامل کیے گئے ہیں تاکہ طلباء کو بورڈ کے امتحان کے ساتھ ساتھ مقابلوں کے امتحانات کے لیے بھی شعوری طور پر تیار کیا جاسکے۔ تخلیق اور تخلیق کار کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے تاکہ طلباء کو سبق اور مصنف و شاعر سے متعلق اہم معلومات فراہم ہو سکیں۔ شامل نصاب ادبی اصناف کا تعارف اور روایت کی تفصیل اس غرض سے پیش کی گئی ہے کہ

طلبا کو یہ علم ہو سکے کہ کس صنف کی کیا خصوصیات اور تقاضے ہیں۔ خواتین اور صوبہ راجستھان کی نمائندگی کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ قواعد اردو سے متعلق معلومات بھی شامل کتاب ہیں۔ صحتِ متن اور طباعت کا حتی الامکان لحاظ رکھا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ زیر نظر نصابی انتخاب طلبا کی تعلیم و تربیت میں معاون ثابت ہوگا۔

مُرتبین

اردو ادب

Distribution of Marks

کل نمبر: 80	وقت: 3.15	
نمبر	موضوع	نمبر شمار
10	خلاصہ مضمون و نظم	۱
17	مضمون نگاری، قواعد	۲
	نصابی کتاب: آئینہ ادب	۳
25	(الف) حصہ نثر	
28	(ب) حصہ نظم	
10	خلاصہ مضمون و نظم	۱۔
17	تصنیف	۲۔
08	(الف) مضمون نگاری (سماجی و ادبی موضوعات پر ایک مضمون)	
	(ب) قواعد: علم بیان و بدیع: تشبیہ، تلمیح، استعارہ، ایہام، حسنِ تعلیل،	
09	مراعات النظر (چار میں سے تین صنعتوں کی تعریف مع مثال)	
25	حصہ نثر	۳۔
08	(الف) اقتباسات کی تشریح اور ان پر مشتمل مختصر سوالات	

- (ب) شاملِ نصاب مضامین میں سے مختصر سوالات (چار میں سے تین) 06
- (ج) ایک تفصیلی سوال (دو میں سے ایک) 5
- (د) سوانح حیات: نصاب میں شامل کسی ایک مصنف کی سوانح حیات اور طرزِ تحریر پر تبصرہ۔ 06
- ۲۔ حصہ نظم: 28
- (الف) شاملِ نصاب منظومات میں سے دو اجزائے نظم کی تشریح (تین میں سے دو) 08
- (ب) شاملِ نصاب منظومات/غزلیات پر مشتمل تفصیلی سوال (دو میں سے ایک) 06
- (ج) شاملِ نصاب شعرا میں سے کسی ایک کے حالاتِ زندگی پر تبصرہ اور اس کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ۔ 06
- (د) شاملِ نصاب منظومات میں سے چار مختصر سوالات (پانچ میں سے چار) 08
- مجوزہ کتابِ نصاب: آئینہ ادب
(راجستھان پاٹھیہ پبلیکیشنز، جے پور سے طبع شدہ)

اردو ادب (نصاب)

نصابی کتاب: آئینہ ادب

حصہ نثر

- ۱۔ داستان: تعریف اور مختصر تاریخ ڈاکٹر فیروز بیگ
- میرامن: سیر پہلے درویش کی (میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے)
- ۲۔ ناول: تعریف اور مختصر تاریخ ڈاکٹر فیروز بیگ
- ڈپٹی نذیر احمد: مرزا ظاہر دار بیگ
- ۳۔ مختصر افسانہ: تعریف اور مختصر تاریخ ڈاکٹر قائم علی خاں
- (i) منشی پریم چند: قول کا پاس
- (ii) سریندر پرکاش: بجو کا
- ۴۔ مکتوب نگاری: ایک تعارف ڈاکٹر معین الدین شاہین
- مرزا غالب:
- (i) بنام میاں داد خاں سیاح (منشی صاحب سعادت و اقبال...)
- (ii) بنام چودھری عبدالغفور سرور (بندہ پرور بہت دن کے بعد...)
- ۵۔ مضمون و انشا پردازی: ایک تعارف ڈاکٹر شاہد الحق چشتی
- (i) ابوالکلام آزاد: حقیقی عظمت

x

- (ii) وحید الدین سلیم: خطاب بہ طلبا
۶۔ طنز و مزاح: ایک تعارف
ڈاکٹر معین الدین شاہین
پطرس بخاری: سویرے جوکل آنکھ میری کھلی
۷۔ قواعد: علم بیان و بدیع
بہیرالال
۸۔ لسانیات: (سرلیع مطالعہ)
(i) اردو زبان کی پیدائش: مختلف نظریات
ڈاکٹر فیروز بیگ
(ii) دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ
ڈاکٹر قائد علی خاں
(iii) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات
ڈاکٹر قائد علی خاں
(iv) علی گڑھ تحریک
ڈاکٹر فیروز بیگ

حصہ پنجم

- ڈاکٹر شاہد الحق چشتی
غزل: ایک تعارف
غزلیات:
(الف) مرزا غالب:
(i) یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
(ii) کیوں جل گیا نہ تابِ رُخ یار دیکھ کر
(ب) مومن خاں مومن:
(i) اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا

(ii) ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
(ج) داغ دہلوی:

(i) جلوے میری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں

(ii) غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا

(د) جگر مراد آبادی:

(i) دل کو سکون روح کو آرام آ گیا

(ii) برابر سے بچ کر گزر جانے والے

(ہ) فراق گورکھپوری:

(i) آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے

(ii) ہر کائنات سے یہ الگ کائنات ہے

قصیدہ: تعریف اور مختصر تاریخ ڈاکٹر معین الدین شاہین

(i) مرزا محمد رفیع سودا: (اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل)

(ii) شیخ محمد ابراہیم ذوق: (ساون میں دیا پھر مرہ شوال دکھائی)

مرثیہ: تعریف اور مختصر تاریخ ڈاکٹر قائم علی خاں

(i) میر انیس:

امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی: فرزندِ پیمبر کا مدینے سے سفر ہے (انتخاب)

(ii) خواجہ الطاف حسین حالی (مرثیہ غالب: بلبل ہند مر گیا ہیہات)

نظم: ایک تعارف ڈاکٹر معین الدین شاہین

(i) نظیر اکبر آبادی: روضہ تاج گنج

xii

- (ii) خواجہ الطاف حسین حالی: جدید ترقیات
(iii) علامہ اقبال: شعاع اُمید
(iv) برج نرائن چکبست: رامائن کا ایک سین (انتخاب)
(v) قابلِ اجمیری: بہ یادِ اجمیر

معاون کتب:

- ۱۔ تاریخ ادب اردو: از پروفیسر سید نور الحسن نقوی
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
۲۔ اردو قواعد: این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔نئی دہلی

فہرست

حصہ نثر

صفحہ نمبر	مضمون نگار/مصنف/مرتب	عنوان	نمبر شمار
iv	پروفیسر بی۔ ایل۔ چودھری	دو لفظ	☆
v	مرتبین	پیش لفظ	☆
2	ڈاکٹر فیروز بیگ	داستان: تعریف اور مختصر تاریخ	۱
6		میرامن	۲
8	میرامن دہلوی	سیر پہلے درویش کی	۳
15	ڈاکٹر فیروز بیگ	ناول: تعریف اور مختصر تاریخ	۴
20	ڈپٹی نذیر احمد	مرزا ظاہر دار بیگ	۵
36	ڈاکٹر قاسم علی خان	مختصر افسانہ: تعریف اور مختصر تاریخ	۶
40	منشی پریم چند	قول کا پاس	۷
47	سریندر پرکاش	بجوکا	۸
59	ڈاکٹر معین الدین شاہین	مکتوب نگاری: ایک تعارف	۹
63	مرزا غالب	خط بنام میاں داد خاں سیاح	۱۰
68	مرزا غالب	خط بنام چودھری عبدالغفور سرور	۱۱
74	ڈاکٹر شاہد الحق چشتی	مضمون و انشا پردازی: ایک تعارف	۱۲
77	مولانا ابوالکلام آزاد	حقیقی عظمت	۱۳

86	وحید الدین سلیم	خطاب بہ طلبا	۱۴
98	ڈاکٹر معین الدین شاہین	طنز و مزاح: ایک تعارف	۱۵
102	پطرس بخاری	سویرے جوکل آنکھ میری کھلی	۱۶
118	ہیرالال	قواعد: علم بیان و بدیع	۱۷

حصہ نظم

صفحہ نمبر	مضمون نگار/شاعر	عنوان	نمبر شمار
123	ڈاکٹر شاہد الحق چشتی	غزل: ایک تعارف	۱
127		مرزا غالب:	۲
130	مرزا غالب	۱- یہ نہ تھی ہماری قسمت.....	
131	مرزا غالب	۲- کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار.....	
135		مومن خاں مومن:	۳
137	مومن خاں مومن	۱- اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا	
138	مومن خاں مومن	۲- ٹھانی تھی دل میں.....	
141		داغ دہلوی:	۴
144	داغ دہلوی	۱- جلوے مری نگاہ میں....	
145	داغ دہلوی	۲- غضب کیا تیرے وعدے پہ.....	
148		جگر مراد آبادی:	۵
150	جگر مراد آبادی	۱- دل کو سکون روح کو.....	
151	جگر مراد آبادی	۲- برابر سے بچ کر.....	

154		فراق گورکھپوری:	۶
157	فراق گورکھپوری	۱۔ آنکھوں میں جو بات.....	
158	فراق گورکھپوری	۲۔ ہر کائنات سے یہ.....	
161	ڈاکٹر معین الدین شاہین	قصیدہ: تعریف اور مختصر تاریخ	۷
164		مرزا محمد رفیع سودا:	۸
166	مرزا محمد رفیع سودا	اٹھ گیا بہمن ودے کا..... (انتخاب)	
176		محمد ابراہیم ذوق:	۹
178	محمد ابراہیم ذوق	ساون میں دیا پھر مہ شوال.. (انتخاب)	
185	ڈاکٹر قاسم علی خاں	مرثیہ: تعریف و تاریخ	۱۰
188		میر انیس:	۱۱
191	میر انیس	امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی (انتخاب)	
200		خواجہ الطاف حسین حالی:	۱۲
203	خواجہ الطاف حسین حالی	مرثیہ غالب (انتخاب)	
209	ڈاکٹر معین الدین شاہین	نظم: ایک تعارف	۱۳
212		نظیر اکبر آبادی:	۱۴
214	نظیر اکبر آبادی	روضہ تاج گنج	
221		خواجہ الطاف حسین حالی:	۱۵
223	خواجہ الطاف حسین حالی	جدید ترقیات	
229		علامہ اقبال:	۱۶
231	علامہ اقبال	شعاع اُمید	

238		برج نرائن چکبست:	۱۷
240	برج نرائن چکبست	رامائن کا ایک سین (انتخاب)	
248		قابل اجمیری:	۱۸
251	قابل اجمیری	بہ یاد اجمیر	

سرلیح مطالعہ

صفحہ نمبر	مضمون نگار / مصنف / مرتب	عنوان	نمبر شمار
257	ڈاکٹر فیروز بیگ	اردو زبان کی پیدائش: مختلف نظریات	۱
261	ڈاکٹر قائد علی خاں	دبستان دہلی	۲
265	ڈاکٹر قائد علی خاں	دبستان لکھنؤ	۳
268	ڈاکٹر قائد علی خاں	فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	۴
273	ڈاکٹر فیروز بیگ	علی گڑھ تحریک	۵

حصہ ششم

ڈاکٹر فیروز بیگ

داستان: تعریف اور مختصر تاریخ

داستان نثری ادب کی قدیم اور مقبول صنف ہے۔ قصہ، کہانی کو ایک صنف کی حیثیت سے داستان ہی نے متعارف کیا۔ اگرچہ ابتداً داستانیں سنائی جاتی تھیں۔ بعد میں تحریری شکل میں منظر عام پر آئیں۔ فطرت انسانی ہے کہ قصہ، کہانی کہنا اور سننا اس کا محبوب مشغلہ رہا۔ داستانیں اُس وقت وجود میں آئیں جب لوگوں کے پاس فرصت اور فراغت تھی۔ اس لیے داستانیں وقت گزاری کا ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔

داستان ایک طویل اور مسلسل قصے کو کہتے ہیں، جس کی بنیاد حقیقت پر نہیں ہوتی بلکہ فرضی و خیالی چیزیں اور مافوق الفطرت عناصر پر ہوتی ہے۔ جس کا مقصد تفریح طبع اور تفکرات سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوتا تھا۔ جب انسانی شعور ترقی یافتہ نہ تھا اُس وقت یہ داستانیں انسان کی آرزوؤں، امنگوں اور جذبات کی تسکین کرتی تھیں، وہ چیزیں جو اسے حقیقی زندگی میں حاصل نہیں ہوتی تھیں وہ اسے خوابوں کی دنیا میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

داستان کے فن پر نظر ڈالیں تو پلاٹ، کردار، مکالمہ، مافوق الفطرت عناصر، تخیل و مبالغہ اور انجام یہ داستان کے لازمی اجزا ہیں جس کے بغیر داستان مکمل نہیں ہوتی۔
داستان کے اجزا مندرجہ ذیل ہیں:-

پلاٹ:

پلاٹ واقعات کی ترتیب و تنظیم کو کہتے ہیں، جو داستانوں میں اکثر مفقود ہے۔ داستانوں کے پلاٹ عموماً مربوط و مسلسل نہیں ہوتے۔ ایک قصہ میں دوسرا قصہ پیوست ہوتا ہے، مرکزی قصے میں ضمنی قصے

جوڑ دیے جاتے ہیں جو اس کی طوالت میں اضافہ کرتے ہیں، دلچسپی اس کا بنیادی عنصر ہے، داستانیں زیادہ تر عشقیہ موضوعات پر لکھی جاتی تھیں۔

کردار:

داستانوں میں کردار حقیقی زندگی کے کرداروں سے بالکل مختلف غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک، بادشاہ، وزیر، شہزادہ، شہزادیاں، نجومی، رمال، جن، دیو، پری ہوتے ہیں، شہزادہ اپنی منزل مقصود کو حاصل کرنے کے لئے فوق الفطری عناصر سے نبرد آزما ہوتا ہے اور اپنی محبت کو حاصل کر لیتا ہے۔

ما فوق الفطرت عناصر:

فوق الفطری عناصر داستانوں کا لازمی جزو ہے، یعنی جن، دیو، پری، ہوا میں پرواز کرتے ہوئے قالین، بولتے ہوئے جانور، جادو کی ٹوپی، عجیب الخلق لوگ اگر ان کو داستانوں سے نکال دیا جائے تو داستان، داستان نہ رہے۔

تخیل و مبالغہ:

تخیل اور مبالغہ پر داستان کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ داستانیں خیالی و فرضی واقعات پر استوار ہوتی ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا سارے واقعات حیرت و استعجاب میں ڈالنے والے ہوتے ہیں۔

انجام:

داستانوں کا انجام ہمیشہ نشاطیہ اور رجائی ہوتا ہے، یہاں انسان کی کبھی شکست نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ اپنے دشمنوں پر فتح حاصل کرتا ہے۔ داستانوں میں زندگی کا راز مایوسی پر نہیں امید پر قائم ہے۔ داستانوں میں حق اور باطل کا ٹکراؤ اور باطل پر حق کی فتح دکھائی جاتی ہے۔ داستانوں میں زبان و بیان کی رنگینی عبارت آرائی اور لطافت کا ہونا ضروری ہے۔

داستان کی تاریخ

اردو میں داستانیں نظم و نثر دونوں میں لکھی گئیں۔ اردو میں منظوم داستانوں کا سلسلہ ۱۴۳۵ء سے ملتا ہے۔ فخر دین نظامی کی مثنوی 'کدم را و پدم راؤ' کو پہلی منظوم داستان کہا جاتا ہے۔ اور نثر میں ملا وجہی کی 'سب رس' کو جو ۱۶۳۵ء میں لکھی گئی، اردو نثر کی پہلی داستان کہا جاتا ہے۔ دکن میں 'سب رس' کے علاوہ منشی محمد ابراہیم بیجا پوری نے فارسی 'انوارِ سہیلی' کا ترجمہ دکنی 'انوارِ سہیلی' کے نام سے کیا۔ شمس الدین احمد نے 'الف لیلیٰ' کا پہلا اردو ترجمہ 'حکایت الجلیلیہ' کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ دکنی 'سنگھاسن بتیسی' اور 'مملکہ زماں و کام کندلہ' اہم داستانیں ہیں۔

شمالی ہند میں اٹھارویں صدی سے قبل کوئی داستان نہیں ملتی، اٹھارویں صدی میں شمالی ہند کی داستانوں میں عیسوی خاں کی 'قصہ مہر افروز و دلبر'، عطا حسین خاں تحسین کی 'نوطر ز مرصع'، مہر چند کھتری کی 'نو آئین ہندی'، عرف قصہ ملک محمد و گیتی افروز، سید حسین شاہ حقیقت کی 'جذب عشق'، مغل حکمران شاہ عالم ثانی کی 'عجائب القصص' بھی اہم داستانیں ہیں۔

اردو داستان کو فروغ دینے میں فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی داستانوں کو فروغ نہیں کیا جاسکتا، ان میں میرامن کی 'باغ و بہار'، حیدر بخش حیدری کی 'آرائش محفل' اور 'طوطا کہانی'، شیر علی افسوس کی 'باغ اردو'، مرزا علی لطف کی 'تذکرہ گلشن ہند'، بہار علی حسینی کی 'نثر بے نظیر'، اخلاق ہندی، مظہر علی ولا کی 'مادھونل اور کام کندلہ'، ہفت گلشن، مرزا کاظم علی جواں کی 'شکنتلا'، نہال چند لاہوری کی 'مدہب عشق'، قابل ذکر ہیں۔ اسی دور میں فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی داستانیں لکھی گئیں ان میں انشا اللہ خاں آتشا کی

’رانی کیتکی کی کہانی‘، رجب علی بیگ سرور کی، ’فسانہ عجائب‘ اہم ہیں۔ ’فسانہ عجائب‘ شمالی ہند کی پہلی اہم طبع زاد داستان ہے۔

’غرض‘ داستان امیر حمزہ، ’بوستان خیال‘، ’آرائش محفل‘، ’باغ و بہار‘، ’فسانہ عجائب‘، ’الف لیلا‘، ’رانی کیتکی کی کہانی‘ وغیرہ اردو کی مشہور داستانیں ہیں۔

میرامن

میرامن کا نام میرامان علی تھا اور امن تخلص کرتے تھے۔ ۱۷۵۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ مغل بادشاہ عالم گیر شاہ ثانی کے عہد حکومت تک دربار شاہی سے وابستہ رہے، اور خانہ زاد موروثی و منصب دار قدیمی کہلائے۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملے نے دلی شہر کو تباہ و برباد کر دیا اور سورج مل جاٹ نے ان کی آبائی جاگیر پر قبضہ کر لیا، تو میرامن دہلی کو خیر باد کہہ کر عظیم آباد (پٹنہ) چلے آئے۔ کچھ عرصہ یہاں رہے مگر روزگاری کوئی صورت نہ بنی۔ آخر کار کلکتہ پہنچے۔ کچھ وقت بے روزگاری میں گزارا۔ آخر منشی میر بہادر علی حسینی کے ذریعہ جان گل کرسٹ سے رسائی ہوئی اور فورٹ ولیم کالج میں منشی کی حیثیت سے ملازمت حاصل کی۔

میرامن نے فورٹ ولیم کالج کے اردو زبان کے شعبے کے صدر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر انگریز افسروں کو اردو سکھانے کے لیے فارسی قصہ چہار درویش کا ترجمہ ”باغ و بہار“ کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔ اس ترجمہ میں انھوں نے ٹھیٹھ ہندوستانی زبان کا استعمال کیا ہے اور دلی کی بول چال کی زبان اور محاورے بڑی خوبصورتی سے استعمال کیے ہیں۔ میرامن نے لکھا ہے کہ ”باغ و بہار“ کی زبان وہی ہے جو دہلی کے بچے، بوڑھے، مرد، عورت اور ہندو مسلمان بولتے ہیں۔ میرامن سے پہلے میر عطا حسین خان تحسین بھی ”نوطر زمرصع“ کے نام سے اس قصے کا ترجمہ کر چکے تھے۔ لیکن اس کی زبان بہت مشکل تھی لیکن میرامن نے اس قصہ میں نہایت آسان، صاف اور بول چال کی

زبان استعمال کی۔

باغ و بہار میں چار درویشوں کے قصے بڑے پُر لطف انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں شامل قصہ ”سیر پہلے درویش کی“ میں بھائی اور بہن کا قصہ ہے۔ میرامن نے بہن کا ایسا صحیح اور موثر تصور پیش کیا ہے کہ ہمارے پورے داستانی ادب میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ باغ و بہار میں ہر قسم کے فوق فطری عناصر موجود ہیں۔ دیو، پری، بلائیں، جادوگر اور عجیب الخلقیت کا ذکر ہے۔ میرامن کی زبان سادہ، سلیس اور با محاورہ ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ بھی نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ باغ و بہار میں اُس زمانے کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ اس میں اخلاقی رنگ بھی ہے اور حسن و عشق کی رنگینیاں بھی۔ اس میں اچھی داستان کی ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ میرامن نے ایک اور فارسی کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کی ”اخلاقِ محسنی“ کا ”گنجِ خوبی“ کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا لیکن یہ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں میرامن کا انتقال ہوا۔

میرامن دہلوی

سیر پہلے دور لیش کی

میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز کا ملک التجا رخواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا پپاری ان کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے، خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے، اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کی گھر میں موجود تھی۔ ان کے یہاں دولٹ کے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہی فقیر جو کفنی میلی پہنے ہوئے مرشدوں کی حضوری میں حاضر اور بولتا ہے۔ دوسری ایک بہن جس کی قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی اور شہر کے سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی۔ وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو اس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے؟ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوز سے ماں باپ کے سائے میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب فن، سوداگری کا بھی کھاتا، روز نامچہ سکھینے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گزرے۔ کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے الہی سے مر گئے۔

عجب طرح کا غم ہوا جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ ایک بارگی یتیم ہو گیا۔ کوئی سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات دن رویا کرتا، کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کرکٹے۔ چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی، سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا۔ دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ پس صبر کرو، اپنے گھر کو دیکھو، اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے۔ اپنے کاروبار لین دین سے ہشیار رہو۔ تسلی دے کر وہ رخصت ہوئے۔ گماشتے کاروباری، نوکر چاکر جتنے تھے ان کو حاضر ہوئے۔ نذریں دیں اور بولے کوٹھے نقد و جنس کی اپنی نظر مبارک سے دیکھ لیجئے۔ ایک بارگی جو اس دولت بے انتہا پر نگاہ

پڑی، آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کا حکم کیا۔ فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت پر دے، چلوئیں تکلف کی لگا دیں اور اچھے اچھے خدمت گار، دیدہ رونو کر رکھے۔ سرکار سے زرق برق کی پوشاکیں بنوادیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے، پھانکڑے، مفت پر کھانے پینے والے، جھوٹے خوشامدی آکر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے، اُن سے آٹھ پہر صحبت رہنے لگی ہر کہیں کی باتیں اور زلمیں، واہی تباہی ادھر ادھر کی کرتے اور کہتے ”اس جوانی کے عالم میں کیتکی کی شراب یا گل گلاب کھنچو ایسے نازنین معشوقوں کو بلوا کر ان کے ساتھ پیچھے اور عیش کیجئے۔“

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے! ہر دم کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب ناچ اور جوئے کا چرچا شروع ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی، جو جس کے ہاتھ پڑا الگ کیا، گویا لوٹ مچادی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے، کہاں سے آتا اور کدھر جاتا ہے۔ مالِ مُفت دلِ بے رحم۔ اس درخچی کے آگے اگر گنج قارون کا ہوتا تو بھی وفانہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچ بھر خون اپنا ہر بات میں نثار کرتے تھے کا نور ہو گئے۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے ڈھیلے، خاص بردار، ثابت خانی سب چھوڑ کر کنارے لگے۔ کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا، جو کہے یہ کیا تمہارا حال ہوا۔ سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ بھرا۔

اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑا کے کھینچے تاب بھوک کی نہ لاسکا۔ لاچار بے حیائی کا برقعہ منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا بہن کے پاس چلیے۔ لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا۔ نہ خالی خط لکھا بلکہ اس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے ان کا بھی جواب اس خوابِ خرگوش میں نہ بھیجا۔ اس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا،

پرسوائے اس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جوں توں پایادہ خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر ہمیشہ کے شہر میں جا کر اُس کے مکان پر پہنچا۔

وہ ماں جانی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی تیل، ماش اور کالے نکلے مجھ پر سے صدقے کیے، کہنے لگی اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا، لیکن بھیا تیری یہ کیا صورت بنی؟ اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہادھو کر وہ کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس، بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات حلوا، سوہن پستہ، مغزی ناشتے کو اور تیسرے پہر میوے، خشک و تر پھل پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاؤنان قلیے، کباب تحفہ تحفہ، مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا، خدا کی درگاہ میں ہزار ہزار شکر بجالایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گزرے کہ پانوں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی کہنے لگی۔ ”اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر بیٹتا ہے اُس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمہارے رہنے پر کہیں گے، اپنے باپ کی دولت دنیا کھو، کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چڑی کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی و مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔ یہ بات سن کر مجھے بھی غیرت آئی، اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا ”اچھا اب تم ماں کی جگہ ہو،

جو کہو سو کروں، یہ میری مرضی پا کر گھر میں جا کے، پچاس توڑے اشرفی کے اصیل لونڈیوں کے ہاتھوں میں لو کر میرے آگے لارکھے اور بولی ”ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے۔ تم ان روپیوں سے جنس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایمان دار کے حوالے کر کے، دست آویز پکی لکھو لو اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو، اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لچو یا آپ بیچو۔“ میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر، ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت و خواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ فقیر نے خشکی کے راستے چلنے کی تیاری کی۔ جب رخصت ہونے لگا، بہن نے ایک سرے پاو بھاری اور ایک گھوڑا جزاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان ایک خاصدان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوادی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا، وہی کاٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی ”سدھارو! تمہیں خدا کو سونپا۔ پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو، میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا، ”تمہارا بھی اللہ حافظ ہے، میں نے قبول کیا۔“ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
دولت مند، سوداگر، ساہوکار	مہاجن
وہ شخص جسے کوئی کام سپرد کیا گیا ہو، کارندہ، منیم، وکیل	گماشتہ
ہدایت کرنے والا، رہنما، پیر، اُستاد	مرشد
والد ماجد، بزرگ	قبلہ گاہ
سپاہی کا کام یا پیشہ	سپاہ گری
ہر روز حساب لکھنے کی کتاب، ڈائری	روزنامچہ
فکر، سوچ، خوف	اندیشہ
چالیسواں، چالیسویں کا فاتحہ	چہلم
قسم، عہد، سوگند، بڑوں کی رسم کے خلاف	آن
کسی بڑے کے سامنے کوئی چیز بطور تحفہ پیش کرنا	نذر
لاگ، پیار، دوستی، نسبت، برابری، ہمسری، ڈھنگ، شروع	لگا
شان و شوکت والا	زرق برق
چھوٹی تعریفیں کرنے والا۔	خوشامدی
واقف کار، جان پہچان والا	آشنا
ساتھی، ہم نشین، خاص دوست	مُصاحب
ساتھ، دوستی، ہمراہی، مجلس، بل بیٹھنا	صحبت

زئلیں	بکواس، بے معنی بات، فضول قصہ
عالم	زمانہ، دُنیا، مخلوق، قسم، جنس، حالت صورت، ڈھنگ
مزاج	طبیعت، خاصیت، عادت
رقیب	معشوق کے عاشقوں میں سے کوئی ایک
قارون	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی جو بہت مالدار تھا۔
فقط	صرف، تنہا، اکیلا، بس، ختم
میسر	وہ چیز جو آسانی سے مل سکے، حاصل، موجود
قصد	ارادہ، نیت، مطلب، کوشش
اشتیاق	شوق، آرزو، تمنا
پا پیادہ	پیدل، سواری کے بغیر، پاؤں پاؤں
لوزیات	بادام کا حلوہ
تصدیع	دکھ، درد، تکلیف
فراغت	نجات، رہائی، اطمینان، آسودگی
خلوت	تنہائی کی جگہ، خواب گاہ
موتی مٹی	مراہوا، مردہ، نعش، میت
نوشت و خواند	تحریر، لکھائی، لکھنا پڑھنا
خشکی	سوکھاپن، نمی نہ ہونا، روکھاپن، زمین
تواضع	خاطرمدارت، مہمان نوازی

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ ”سیر پہلے درویش کی“ کس داستان کا قصہ ہے؟
- ۲۔ ”باغ و بہار“ کے مصنف کا کیا نام ہے؟
- ۳۔ مرشدوں کی حضوری میں کون حاضر رہتا تھا؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ پہلے درویش کو عجب طرح کا غم کیوں ہوا؟
- ۵۔ داستان ”باغ و بہار“ کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟
- ۶۔ بہن نے پہلے درویش کی خاطر داری کس طرح کی؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ داستان کسے کہتے ہیں؟ داستان کی تعریف اور اجزائے ترکیبی بیان کیجیے۔
- ۸۔ میرامن کی حالات زندگی تحریر کیجیے اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

ناول: تعریف اور مختصر تاریخ

ناول اطالوی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ”نیا“ کے ہیں۔ زندگی کی عکاسی کرنے والے مسلسل قصے یا کہانی کو ناول کہا جاتا ہے۔ یہ کہانی کی جدید صنف ہے جو داستان کے بعد منظر عام پر آئی۔ وقت کی ضرورت اور زمانہ کے حالات کے سبب ناول وجود پذیر ہوا۔ ناول میں داستان کے برعکس زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ناول اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ناول سیاسی، سماجی، اخلاقی، اصلاحی، تاریخی سبھی موضوعات پر لکھے گئے جہاں تک فن اور تکنیک کا تعلق ہے ناول میں کہانی، پلاٹ کردار، مکالمے، پس منظر، زماں و مکاں، اسلوب، نقطہ نظر، ضروری اجزاء ہیں جو کم و بیش سبھی ناولوں میں ملتے ہیں۔

۱۔ کہانی:

ناول کا بنیادی عنصر ہے، ناول میں کہانی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر افسانوی صنف چاہے وہ داستان ہو، ناول ہو، مختصر افسانہ ہو یا ڈرامہ سبھی میں کہانی اس کا اہم حصہ ہوتی ہے۔ ناول میں حقیقی زندگی کی کہانی پیش کی جاتی ہے۔ قدیم زمانے سے ہی انسان قصے کہانیوں میں دلچسپی لیتا رہا ہے لیکن وقت کے ساتھ اس کے روپ بدلتے رہے۔ ہر کہانی میں ابتدا ہوتی ہے درمیانی حصہ نقطہ عروج ہوتا ہے پھر کہانی انجام پر ختم ہوتی ہے۔ کہانی میں دلچسپی کا برقرار رہنا انتہائی ضروری ہے۔

۲۔ پلاٹ:

پلاٹ میں واقعات کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جس میں ربط کا ہونا ضروری ہے۔ کہانی

میں مختلف واقعات ہوتے ہیں۔ ایک واقعے کا دوسرے واقعے پر جو اثر پڑتا ہے اس کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ پلاٹ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مربوط پلاٹ دوسرے غیر مربوط پلاٹ۔ مربوط پلاٹ میں غیر اہم واقعات اور کرداروں کو بڑے پیمانے پر پیش نہیں کیا جاتا بلکہ ضروری اور اہم واقعات و کرداروں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ غیر مربوط پلاٹ وہ ہوتے ہیں جس میں بے شمار واقعات و کردار بے ترتیب انداز میں موجود رہتے ہیں۔

۳۔ کردار:

ناول میں حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے چلتے پھرتے کردار ہوتے ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں ہمیں نظر آتے ہیں، کردار ہی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ناول کے کرداروں کی خوبی اس بات پر منحصر ہے کہ وہ ایسے جیتے جاگتے ہوں کہ ہم انہیں حقیقی انسان سمجھ لیں جیسے نذیر احمد کا ناول 'مراۃ العروس' میں اصغری و اکبری کا کردار، 'توبۃ النصوح' میں مرزا ظاہر دار بیگ کا کردار، مرزا ہادی رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' میں امراؤ جان ادا کا کردار اتنے حقیقی معلوم ہوتے ہیں کہ ان پر فرضی و خیالی ہونے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ کردار دو طرح کے ہوتے ہیں یک رخی (Flat) دوسرے پہلو دار (Round) کردار جو کہانی کو مکمل بناتے ہیں۔

۴۔ مکالمے:

کرداروں کے درمیان آپسی گفتگو اور بات چیت کو مکالمے کہتے ہیں، مکالمہ فطری اور کرداروں کے حسب مراتب ہونے چاہئیں۔ کردار جس حیثیت اور طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اسی کے مطابق مکالمے لکھے جاتے ہیں۔ جیسے بادشاہ کے مکالموں سے اس کے شاہی مرتبہ اور غلام کے مکالموں سے عاجزی و انکساری ظاہر ہونی چاہیے۔ اعلیٰ متوسط اور ادنیٰ سبھی طبقے کے کردار کہانی کا حصہ ہوتے ہیں۔ ناول نگار کو اچھے مکالمے لکھنے کے لیے زبان و بیان پر قدرت ہونا بہت ضروری ہے۔

۵۔ زماں و مکاں:

ناول میں کہانی کو سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر، ماحول اور زماں و مکاں کا اہم رول ہوتا ہے، کردار کس ماحول کا پروردہ ہے، قصہ میں پیش آنے والے واقعات کس مقام اور زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں غرض ناول نہ صرف اپنے دور کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ اس دور کی تہذیب و معاشرت، اخلاقی اقدار کی جھلک بھی ان میں دیکھی جاسکتی ہے۔ چونکہ ناول حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اس لیے ان کا ماحول، پس منظر اور زماں و مکاں بھی اتنے ہی حقیقی ہوتے ہیں۔

۶۔ اسلوب:

ناول میں اسلوب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس پر ناول کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے، مصنف کا اسلوب بیان ہی اس کی پہچان بنتا ہے۔ ہر صنف ادب کا اسلوب منفرد ہوتا ہے، ناول میں واقعات کی ترتیب ہو یا کرداروں کا ارتقاء یا قصہ میں دلچسپی کا عنصر سب ناول نگار کے بہترین اسلوب نگارش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

۷۔ نقطہ نظر:

ناول نگار زندگی کے جس پہلو کو کرداروں کے ذریعہ قاری تک پہنچاتا ہے اس میں اس کا نقطہ نظر واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے جیسے نذیر احمد کی ناول میں ان کا اصلاحی نقطہ نظر صاف نظر آتا ہے۔ امراؤ جان ادا کے قصے کو پڑھ کر ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ انسان بذات خود راہِ راست پر ہوتا ہے لیکن حالات و واقعات بھی اسے برے راستے پر لے جاتے ہیں۔

۸۔ ناول کا ارتقا:

اردو میں ناول نگاری کا آغاز نذیر احمد سے مانا جاتا ہے۔ ان کا ناول ”مراۃ العروس“ جو کہ

۱۸۶۹ء میں لکھا گیا اردو کا پہلا ناول تسلیم کیا گیا۔ نذیر احمد نے متوسط طبقہ کے مسلم گھرانوں کی معاشی اور اخلاقی زندگی پر غور کیا اور اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ 'مراة العروس'، 'بنات العیش'، 'توبتہ النوح'، 'فسانہ مبتلا'، 'ابن الوقت'، 'ایامی'، 'رویائے صادقہ' ان کے مشہور ناول ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا مشہور ناول 'فسانہ آزاد' ہے جس میں لکھنوی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ 'جام سرشار'، 'سیر کہسار'، 'کامنٹی'، 'کڑم دھڑم' ان کے نمائندہ ناول ہیں۔
عبدالحلیم شرر نے کامیاب تاریخی ناول لکھے۔ فردوس بریں، منصور موہنا، ملک ورجینا ان کے مشہور ناول ہیں۔

مرزا ہادی رسوا کا نام ان کے شاہکار ناول امر او جان ادا کی وجہ سے ادبی حلقوں میں مشہور ہوا۔ یہ ایک بہترین ناول ہے جس میں نفسیاتی تجزیہ بھی موجود ہے اور لکھنوی تہذیب بھی، آپ نے ذات شریف، شریف زادہ، اختر بیگم، افشائے راز ناول بھی لکھے۔

پریم چند اردو کے مشہور اور کامیاب ناول نگار ہیں انہوں نے سماجی مسائل، دیہی زندگی اور حقیقت نگاری کو ناول میں جگہ دی، انہوں نے بہت سے ناول لکھے ان میں 'جلوہ ایثار'، 'بازارِ حسن'، 'گوشہ عافیت'، 'غبن'، 'نرملہ'، 'پردہ مجاز'، 'چوگان ہستی'، 'بیوہ'، 'میدانِ عمل'، 'گودان' شامل ہیں۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا جس نے ادب کو زندگی سے قریب تر کیا۔ اردو ناول کو بعض نئے رجحانات سے روشناس کرایا۔ اس دور میں جو ناول لکھے گئے ان میں سجاد ظہیر کا 'لندن کی ایک رات'، قاضی عبدالغفار کا 'لیلیٰ کے خطوط'، عصمت چغتائی کا 'ٹیرٹھی لکیر'، قرۃ العین حیدر کا 'آگ کا دریا'، کرشن چندر کا 'شکست' اور عزیز احمد کا 'گریز' قابل ذکر ہیں۔

کرشن چندر نے اپنی ناولوں میں اشتراکی خیالات کو پیش کیا وہیں عصمت چغتائی نے متوسط گھرانوں کے لڑکوں کے لڑکیوں کے جنسی مسائل کو ناولوں کا موضوع بنایا، قرۃ العین حیدر کا مطالعہ بہت وسیع

تھا، انہوں نے نئی تکنیک شعور کی رو سے متعارف کرایا اور اسے اپنی ناولوں میں بخوبی برتا۔ آگ کا دریا ان کا مشہور ناول ہے۔

تقسیم ملک کے بعد ان حالات کا عکس اس عہد کی تخلیقات میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس دور میں عبداللہ حسین کا 'اداس نسلیں' شوکت صدیقی کا 'خدا کی بستی' خدیجہ مستور کا 'آنگن' حیات اللہ انصاری کا 'لہو کے پھول' راجندر سنگھ بیدی کا 'ایک چادر میلی سی'، بلونت سنگھ کا 'معمولی لڑکی' قاضی عبدالستار کا 'شب گزیدہ' مہندر ناتھ کا 'ارمانوں کی تیج' جمیلہ ہاشمی کا 'تلاش بہاراں' جیلانی بانوں کا 'ایوانِ غزل' انور سجاد کا 'خوشیوں کا باغ' انتظار حسین کا 'بستی' سلیم اختر کا 'ضبط کی دیوار' جیسے ناول منظر عام پر آئے۔

ڈاکٹر فیروز بیگ

ڈپٹی نذیر احمد

مولوی نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں بجنور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا نذیر احمد نے عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر مولوی نصر اللہ خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر بجنور سے عربی، نجوم، منطق اور فلسفہ پڑھا۔ چودہ سال کی عمر تھی کہ والد ان کو دہلی لے آئے اور تعلیم کے لئے آپ کو مولوی عبدالحق کے سپرد کیا۔ نذیر احمد نے طالب علمی کے زمانے میں استاد کا حکم بجالانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ مولوی صاحب کے گھر کا سودا سلف لانا، کھانے کی صورت نہ ہوتی تو گھر گھر سے کھانا مانگ کر لاتے۔ ان کی پوتی اپنے گھر اور سارے محلے کا مصالحہ باریک پسواتی تھی۔ مولوی صاحب نے ان کی لیاقت اور پڑھائی میں ان کی ترقی کو دیکھ کر اپنی پوتی کی شادی ان سے کر دی۔ دہلی کالج میں داخلہ لیا۔ انتہائی محنت و لگن سے پڑھائی پوری کی پھر مدرس کی حیثیت سے پنجاب میں تقرر ہوا۔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس کانپور اور الہ آباد مقرر ہوئے۔ تعزیرات ہند کے ترجمے کا کام بھی کیا۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر بنے۔ سر سالار جنگ حیدر آباد نے ان کو حیدر آباد بلا لیا۔ ان کے انتقال کے بعد مولوی صاحب دہلی چلے آئے اور باقی زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ ۱۸۹۷ء میں ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔

نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ آپ نے غیر شعوری طور پر ناول نگاری کی شروعات کی۔ انہوں نے اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم دینے کے لیے ایسے قصے چنے جو دلچسپ بھی ہوں اور نصیحت آموز بھی۔ نذیر احمد نے ناولوں میں حقیقی زندگی کی تصویر کشی کی ہے اور مسلم معاشرت کے جیتے جاگتے مرفعے پیش کیے ہیں۔ نذیر احمد کا ہر ناول اصلاحی ہے اور کسی نہ کسی سماجی عیب کو دور کرنے کے خیال سے لکھا گیا ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں مقصدیت حاوی ہے۔ انہوں نے اپنے قصوں سے دینداری، خدا ترسی اور

اصلاح معاشرت کا کام لیا ہے۔ ان کی نظرفن کے بجائے مقصد پر ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت، خانہ داری، پاکیزہ مذہبی فضا، ان کے ذاتی تجربات و نظریات ہمیں ان کی ناولوں میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ ان ناولوں کے پلاٹ مربوط ہیں۔ کردار نگاری میں انہیں مہارت حاصل ہے۔ مکالمے لاجواب ہیں۔

نذیر احمد کا پہلا ناول ”مراۃ العروس“ ہے جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔ مراۃ العروس کے بعد انہوں نے ”بنات العیش“ لکھا یہ ناول ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ ”توبتہ النوح“ ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۸۵ء میں ”فسانہ بتلا“ لکھا۔ ابن الوقت ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ”ایامی“ پھر ۱۸۹۴ء میں ”رویائے صادقہ“ شائع ہوا۔ انہوں نے ان تمام ناولوں کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور خاص طور پر تعلیم نسواں کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا۔ توبتہ النوح ایک مقصدی ناول ہے۔ نذیر احمد نے ہر کردار کو بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ مرزا ظاہر دار بیگ توبتہ النوح کا ایک زندہ اور فطری کردار ہے ظاہر دار بیگ جیسے خود پسند، خوشامدی، ظاہر دار، نمائش پرست کردار ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ ظاہر دار بیگ جو اصلی زندگی میں دولت و ثروت سے محروم رہا اپنی لفاظی اور جادو بیانی کے ذریعہ اپنی شان و شوکت کو قائم رکھنے میں مصروف تھا۔ امیر زادوں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا، امیروں جیسی عادتیں اختیار کرنا اور ان ہی لوگوں کی طرح وضع قطع بنانا، مشاعروں اور نشستوں میں بلا تکلف جانا اور خود کو جمعدار کی اولاد ظاہر کرنا، کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے ہم اس پر لطف کردار کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہو جاتے ہیں گرچہ یہ کردار مختصر عرصے کے لئے ہمارے سامنے آتا ہے مگر اپنی چرب زبانی سے جھوٹ کو سچ بنا کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہمیں اس کی غلط بیانی کا گمان تک نہیں ہوتا۔

نصاب میں شامل سبق مرزا ظاہر دار بیگ نذیر احمد کی ناول ”توبتہ النوح“ کا کردار ہے جس میں انہوں نے مرزا ظاہر دار بیگ کا خاکہ کھینچا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد

مرزا ظاہر دار بیگ

اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا، وہ بھی حقیقی نہیں، ابتدائے عمل داری سرکار میں جناب ریزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار، دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار، تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی، اس پر خود اس کی رشوت ستانی، بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد دلی کے رواداروں میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ جمع دار نے باوجودے کہ دور کی قرابت تھی۔ جب اللہ اس کا تکفل اپنے ذمے لے لیا۔ جمعدار اپنی حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر، اس کے بیٹے پوتے، نواسے کثرت سے تھے۔ انھوں نے بے اعتنائی کی۔ اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے۔ مگر ان کے ورثانے بہ ہزار دقت محل سرا کے پہلو، میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا اور سات روپے مہینے کے کرائے کی دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی، تین تین آدمی اور سات روپے کی کل کائنات اس پر مرزا کی شیخی اور نمود یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار والوں کی برابری کرے، جن کو صد ہارو پے ماہوار کی آمدنی تھی اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے، مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گھستا تھا یہ کسی کو بھائی جان، کسی کو ماموں جان، کسی کو خالو جان بناتا، اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتوں ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے، اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں آرزو بوں تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیر زادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں۔ مگر امیر زادگی نہ تھی تو کیسے؟ دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہتیرا بکتی، مگر کون سنتا تھا؟ مرزا کو جب دیکھو، پانوں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی، سر پر دوہری ہیل کی بھاری کامدار ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دوڑو

انگر کھے، اوپر ہلکی سی تن زیب، نیچے کوئی طرح دار ڈھا کے کانینو، جاڑا ہوا تو بانا ت، مگر سات روپے گز سے کم کی نہیں، خیر، یہ تو صبح و شام، اور تیسرے پہر کاشانی مخمل کی آصف خانی، جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کم خواب کی عمدہ بیل ٹنکی ہوئی، سرخ بیفہ، پاجامہ اگر ڈھیلے پانچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے، اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں، اور اوپر جلد بدن کی طرح منڈھا ہوا، ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کدائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

کلیم سے، اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف ہوا شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے، یہاں تک کہ چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی، لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے، اور تمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے، مرزا نے اپنا اصلی حال کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا، کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعہ کا تمام تر کہ مرزا کو ملا ہے اور وہ جمعہ کے بیٹے پوتوں کو مرزا کی محل سرا اور جمعہ کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعہ کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا، اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا، تو سیدھا جمعہ کے محل سرا کی دیوڑھی پر جامو جو دہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کندھی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے پوچھا، کون صاحب ہیں، اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟

کلیم۔ جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی۔ کون مرزا؟

کلیم۔ مرزا ظاہر دار بیگ، جن کا مکان ہے، اور کون مرزا؟

لونڈی۔ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں رہتا۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کر لے کہ جلدی سے کلیم نے کہا۔ کیوں جی! کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں؟،،

لونڈی: ”ہے کیوں نہیں؟“

کلیم پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں، کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں؟

لونڈی جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے، مواظہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے؟

دوسری لونڈی: ”اری کم بخت! یہ کہیں مرزا بانگے کے بیٹے کونہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے۔ (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں! وہی ظاہر دار بیگ نا، جن کی رنگت زرد ہے، آنکھیں کرنچی، چھوٹا قد، دُبلّا ڈیل، اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رکھتے ہیں۔“

کلیم: ”ہاں ہاں، وہی ظاہر دار بیگ۔“

لونڈی:،، تو میاں! اس مکان کے پچھواڑے، اپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے، وہ اس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنک جا نگھیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے اہا، آپ ہیں، معاف کیجئے گا میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں، بندہ کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں، میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہم رکاب چلوں۔

کلیم: چلیے گا کہاں؟ میں آپ ہی پاس تک آیا تھا۔

مرزا: پھر اگر کچھ دیر تک تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرادوں؟

کلیم: میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا: بسم اللہ تو چلیے، اسی مسجد میں تشریف رکھیے، بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔
 کلیم نے جو مسجد میں آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پُرانی چھوٹی سی مسجد ہے۔ مسجد ضرار کی
 طرح وحشت ناک، نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلّا، نہ طالب علم نہ مسافر، ہزار ہا چمگا ڈریں اس میں رہتی ہیں کہ
 ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود
 کھڑنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چاروں چاروں اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو
 اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے، مرزا صاحب بہ طور دفع دخل مقدر
 فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ، اختلاجِ قلب کا روگ
 ہے، اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا، اس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ اس
 وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار، تمام ماجرا کہہ سنایا

مرزا: پھر اب کیا ارادہ ہے؟

کلیم: سوائے اس کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا: خیر، نیتِ شبِ حرام، صبح تو ہو، آپ بے تکلف استراحت فرمائیے۔ میں جا کر بچھونا وغیرہ

بھیجے اور مجھے مریضہ کی تیمارداری کے لیے اجازت دیجیے کہ آج اس کی علالت میں اشد اد ہے۔

کلیم: یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں، متعدد دیوان خانے،

کئی پائیں باغ ہیں، حوض اور حمام اور کڑے اور گنج اور دکانیں اور سرائیں ہیں۔ میں تو جانتا ہوں عمارت کی قسم

سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی، جسے تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو، یا یہ حال کہ ایک تنفس کے واسطے ایک شب کے لیے

تمہیں جگہ میسر نہیں جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کیے، ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام

ترکے پر تم قابض اور متصرف ہو، لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمعہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا: آپ کو میری نسبت سے سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی۔ مگر افسوس ہے کہ آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متنبیٰ کیا تھا اور جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندے کو آپ چانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے، صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا، لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا حوصلہ نہیں اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منالے جائیں۔

کلیم: لیکن آپ نے کبھی تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا: اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلالِ مزاج سے بے بہرہ اور غیرت و حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا، اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوگی۔ اجازت دیجیے کہ میں جا کر بچھونا بھجوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔

کلیم: خیر، مقامِ مجبوری ہے، لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجیے، تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا: چراغ کیا، میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن گرمی کے دن ہیں پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا اور اس مکان میں ابا بیلوں کی بھی کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے تھوڑی دیر صبر کیجیے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تھا تو کھانا تیار تھا۔ لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اُس نے کھانے کی مطلق پروانہ کی۔ بے کھاوے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں ہی گے تو کہہ

دو گ۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا، کیوں کہ اوّل تو رات کچھ ایسی زیادہ نہیں گئی تھی، دوسرے اس یہ معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے نکلا ہے، تیسرے دنوں میں بے تکلفی غایت درجے کی تھی، لیکن مرزا قصداً اس بات سے معترض ہی نہ ہوا اور کلیم بے چارے کا یہ حال کے مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتزیوں نے قل ہوا اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا عن قریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے، تو بے چارے نے بے غیرت بن کر کہا

”سنو یار! میں نے کھانا بھی نہیں کھایا“

مرزا: سچ کہو! نہیں جھوٹ بہکاتے ہو۔

کلیم: تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا: مرد خدا! تو نے آتے ہی کیوں نہیں کہا؟ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے؟ دوکانیں سب بند ہو گئیں اور جو ایک دو کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی جن کے کھانے سے فاقہ بہتر، گھر میں تو آج آگ تک نہیں سلگی، مگر ظاہراً تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیواشتہا کو زیر کرنا بہت ہمت والوں کا کام ہے ایک تدبیر سمجھ میں آئی ہے کہ جاؤں چھدا می بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرما گرم چنے کی دال بنوالاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھے اور تجھے دنوں کو کافی ہوگی، رات کا وقت ہے؛ ابھی کلیم کچھ کہنے ہی نہ پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوالائے مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے، یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھٹنے لگا گئے اس واسطے کہ کلیم کے روبہ رودتین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا: ”یار! ہو بڑے خوش قسمت، اس وقت بھاڑ مل گیا، واللہ ذرا ہاتھ تو لگاؤ دیکھو کیسے بھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوش بو، عجیب ہی دل فریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا، مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا، کوئی فن ہو، کمال بھی کیا چیز ہے،

دیکھیے، اتنی رات گئی ہے، مگر چھد امی کی دوکان پر بھیڑ لگی ہوتی ہے، بندے نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھد امی کی دوکان کا چنا بلانا غم لگ کر جاتا ہے اور واقع میں آپ ذرا غور سے دیکھیے، کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے بھئی! تمہیں میرے سر کی قسم، سچ کہنا، ایسے خوبصورت خوش قطع، سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اسے کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں، ٹوٹے پھوٹے کا کیا مذکور! دانوں کی رنگت دیکھیے، کوئی بسنتی ہے، کوئی پستنی، غرض دونوں رنگ خوش نما، یوں تو صد ہا قسم کے غلے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا، آپ نے، وہ ایک ظریف کی حکایت سنی ہے۔“

کلیم: ”فرمائیے۔“

مرزا: ایک مرتبہ چنا حضرت میکائیل کی خدمت میں، جنہیں رزقِ عباد کا کام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جوں ہی میں نے زمین سے سر باہر نکالا، تیر ستم چلنے لگے، ماکولات اور بھی ہیں، مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں، کسی پر نہیں ہوتے نشوونما کے ساتھ میری قطع و برید ہونے لگتی ہے، میری کونپلوں کو توڑ کر لوگ ساگ بناتے ہیں اور مجھے کچے بھی کھا جاتے ہیں۔ جب بار آور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکری بن کر لاکھوں من بونٹ چر جاتے ہیں اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کیے، پکا تو شاخ و برگ بھسن بن کر بیلوں اور بھیسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ اسے چکی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں، بھاڑ میں بھونیں، بیسن بنائیں، کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں، گھنگھیاں پسائیں، غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل ہوتی رہتی ہیں، حضرت میکائیل کے دربار میں چنے کا اس طرح بے باکانہ چڑ پڑ بولنا سن کر حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اسے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکمِ اخیر رخصت ہوا، سو حضرت! یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندانِ آزان پر تیز ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت نمک مریج بہم

نہیں پہنچ سکتا۔ ورنہ میرا مدد کے کبابوں میں یہ خستگی اور سوندھا پن کہاں؟

غرض، مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا، کلیم بھوکا تو تھا ہی، اسے بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔ مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کٹیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دوہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خلوت خانے اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا اور مسجد بھی ایسی، جس کا تھوڑا سا حال ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے، گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا، تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس نہ غم خوار، نہ نوکر نہ خدمت گار، مسجد میں اکیلا بیٹھا تھا، جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہ گار یا قفس میں مرغِ نوگرفار، کوئی اور ہوتا تو اس حالت پر تنبیہ پکڑتا، اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے اعمال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجر دم باپ کے ساتھ نماز میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوچنے تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قضیدہ مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا کوئی اور عیار، ٹوپی، جوتی، رومال، چھڑی، تکیہ، دری یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی، لے کر چمپت ہو گیا، کلیم یوں بھی بہت دیر کو سو کر اٹھتا تھا اور آج رات تو ایک خاص وجہ تھی۔ کوئی پہر سو اپہر دن چڑھے جاگا، تو دیکھتا کیا ہے فرشِ مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں، تو سیروں گرد کا بھھوت اور چمگاڑوں کی بیٹ کا ضما د بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلبِ ماہیت ہو کر کہیں بھٹنا تو نہیں بن گیا، مرزا کو ادھر کو دیکھا، ادھر دیکھا، کہیں پتہ نہیں، مسجد بھی ویران، اس میں پانی کہاں؟ صبر کر کے بیٹھ رہا، کہ اللہ کا کوئی بندہ ادھر کو آنکے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔ اس میں دو پہر ہونے آئی، بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا، جوں ہی زینے پر چڑھا کہ کلیم اس سے عرض مطلب کرنے کے لیے لپکا، وہ لڑکا اس کی ہیبت کدائی دیکھ، ڈر کر بھاگا، خدا جانے اس نے اسے

بھوت سمجھا، یا سڑی خیال کیا، کلیم نے بہتیرا پکارا، اس لڑکے نے پیٹھ کر نہ دیکھا، ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقہ سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا، تو اُلو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا سیدھا مرزا کے مکان پر گیا اور آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو منہ ہاتھ دھونے کو پانی اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی مانگے، تاکہ کسی طرح گلی کو چوں میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اس نے کہا، کیوں حضرت! آپ مجھ سے بھی واقف ہیں؟ اندر سے آواز آئی۔ ہم تمہاری آواز تو نہیں پہچانتے۔ اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔“

کلیم: ”میرا نام کلیم ہے اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔“

گھر والے: ”وہ درمی تکیہ کہاں ہے، جو رات تمہارے سونے کے لیے بھیجا کیا تھا؟“

تکیہ اور درمی کا نام سن کر کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں تامل تھا کہ اندر سے آواز آئی،

”مرزا زبردست بیگ! دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے، دوڑ کر تکیہ، درمی تو اُس سے لو۔“

کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکلنے تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست بیگ نے چور چور کر کے جالیا۔ کلیم نے ہر چند مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کیے۔ مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر، اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کو توالی لے گیا۔ کو توال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سنا اور کلیم نے اس کا بیان سنا پوچھا۔ کلیم ہر چند اپنا پتہ بتانے میں جھینپتا تھا، مگر چار و ناچار اسے بتانا پڑا۔ لیکن اس کی حالت ظاہری ایسی تیز ہو رہی تھی کہ اُس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

لفظ	معانی
عمل داری	حکومت، سلطنت
ریزیڈینٹ	مقیم وکیل شاہی جو گورنمنٹ کی طرف سے غیر ریاست میں مقرر ہوتا ہے
اردلی	ساتھ رہنے والا سپاہی، اطلاع لانے اور لے جانے والا ہر کارہ
جمع دار	چند سپاہیوں کا افسر
عالی جاہ	بلند اور بڑے رتبہ والا
منصب	عہدہ، کام
بے عنوانی	بے قاعدگی، بد انتظامی
رشوت ستانی	رشوت لینا، ناجائز طریقے سے روپیہ حاصل کرنا
رودار	طرفدار، خیر خواہ
اوائل	اول کی جمع ابتدا، شروع
قرابت	نزدیکی، رشتہ داری
تکفل	ذمہ دار ہونا، کفالت
حیات	زندگی، عمر
بے اعتنائی	بے پروائی
وصیت	سفر کرنے یا مرنے کے وقت کی نصیحت

وارث کی جمع، مستحق، میراث لینے والا	ورثا
ٹکڑا، خطہ زمین	قطعہ
سرمایہ، پونجی	کل کائنات
دکھاوا	نمود
مذاقیہ	مسخرہ
سینکڑوں	صدہا
دعویٰ کرنے والا	ادعائی
ستانا، تنگ کرنا	دق
براء، ذلیل	زبوں
نوابوں کا زنان خانہ	محل سرا
ہم راہ، ساتھی، ہم سفر	ہم رکاب
عہد رسالت میں منافقوں کی ایک مسجد	مسجد ضرار
بے وقت کی تسبیح (پڑھنا)	تسبیح بے ہنگام
اینٹ کافرش	کھرنج
اعتراض کا جواب دینا	دفع دخل
مریض، بیمار	علیل
ایک بیماری کا نام جس میں دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے	خفقان
دکھ، بیماری	عارضہ
بے ہوشی	غشی

اصرار	ضد کرنا، ہٹ کرنا
استراحت	آرام
اشتداد	زیادتی کرنا، سختی کرنا
متنفس	سانس لینے والا، جاندار انسان
متصرف	قابض
جاہ	عزت، مرتبہ، قدر
حشمت	دبدبہ، شان و شوکت
شمہ	تھوڑی سی چیز، قلیل مقدار
احتمال	شک و شبہ، وہم و گمان
منتہی	آگاہ کرنا، خبردار کرنا
بے بہرہ	بے خبر، محروم، آوارہ
حمیت	شرم، غیرت، عزت
طیش	غصہ
غایت	انتہا، آخر
اشتہا	بھوک
چشم زدن	پلک جھپکتے، فوراً
خوش قطع	اچھی وضع، طریقہ، انداز
ظریف	خوش طبع، لطیفہ گو
رزقِ عباد	عبدالکی جمع، بندہ، بندوں کا رزق

کاٹ چھاٹ، تراش خراش	قطع و برید
پھلدار	بار آور
پیٹ	شکم
لاٹچ، حرص	دندانِ آرز
گنڈا ہونا، میلا ہونا	کثیف
پنچڑا	قفس
آگاہ کرنا، جھڑکی، نصیحت	تنبیہ
تڑکے، بہت سویرے	گجردم
برائی کرنا	ہجو
الگ، جدا ہونا	منفک
لیپ	ضماد
حق کی جمع، درست، واجب معاوضہ	حقوق
پہچاننا، ذریعہ، خدا شناسی	معرفت

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ نذیر احمد کے والد کا نام کیا تھا؟
- ۲۔ مرزا ظاہر دار بیگ کس ناول کا کردار ہے؟
- ۳۔ مرزا ظاہر دار بیگ کن لوگوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا تھا؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ اردو کا پہلا ناول نگار کون ہے؟
- ۵۔ مرزا ظاہر دار بیگ نے کس کو مسجد میں ٹھہرایا تھا؟
- ۶۔ درج ذیل الفاظ کے معنی تحریر کیجیے۔
منصب، قرابت، علیل، نمود

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ مولوی نذیر احمد کے حالات زندگی اور ان کی ناول نگاری پر روشنی ڈالئے۔
- ۸۔ مرزا ظاہر دار بیگ کے کردار پر تبصرہ کیجیے۔

ڈاکٹر قاسم علی خاں

مختصر افسانہ: تعریف اور مختصر تاریخ

مختصر افسانہ مغربی ادب سے اردو ادب میں داخل ہوا، مختصر افسانہ کو انگریزی میں شارٹ اسٹوری کہا جاتا ہے، اس میں مختصر قصہ ہوتا ہے اس لیے اس میں پوری زندگی کو پیش نہیں کیا جاتا بلکہ زندگی کا ایک واقعہ، ایک کردار، ایک جذبہ ایک خیال یا زندگی کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے، اختصار، جدت، وحدت تاثر، جامعیت، رومانیت اس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

افسانہ ایک جدید ادبی صنف ہے جو وقت کے تقاضوں کے سبب وجود میں آئی اس سے پہلے ناول نگاری کا چلن تھا، امریکی ادیب ایڈگر ایلن پونے افسانے کی تعریف اس طرح کی ہے:-
”مختصر افسانہ ایک ایسی بیانیہ نثری صنف ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جاسکے، جو متاثر کن انداز میں لکھی گئی ہو، جس میں وحدت تاثر اور جامعیت ہو۔“

مختصر افسانے کی امتیازی خصوصیت اختصار ہے اس میں غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں کی گنجائش نہیں ہوتی، نہ تو طویل مکالمے ہوتے ہیں نہ منظر نگاری، ہر جگہ اختصار کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔

مختصر افسانے کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں:

- | | | | |
|---------------------------|----------|-------------|-----------|
| ۱۔ کہانی | ۲۔ پلاٹ | ۳۔ کردار | ۴۔ مکالمہ |
| ۵۔ پس منظر یا زمان و مکان | ۶۔ اسلوب | ۷۔ نقطہ نظر | |

کہانی:

افسانہ میں ایک کہانی ہوتی ہے جو بہت مختصر ہوتی ہے اس میں انسانی زندگی کا پوا احاطہ نہیں ہوتا

بلکہ زندگی کے کسی ایک پہلو، کسی ایک واقعہ یا مقصد کو چند کرداروں کے ذریعہ انجام تک پہنچایا جاتا ہے جو اپنی جگہ جامع اور مکمل ہوتے ہیں۔

پلاٹ:

افسانہ کا بنیادی عنصر ہے جس میں مرکزی خیال کو پیش نظر رکھ کر واقعات کو ترتیب دیا جاتا ہے۔ واقعات میں ربط کا ہونا ضروری ہے، ایک واقعہ کا دوسرے واقعہ سے ایسا تال میل ہو کہ آپس میں فرق کرنا مشکل ہو، یہی پلاٹ کا فن ہے۔

کردار:

کردار نگاری افسانہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، قصہ کو آگے بڑھانے کے لئے کرداروں کا سہارا لیا جاتا ہے لیکن اختصار کے مد نظر افسانے میں چند کردار ہی پیش کیے جاتے ہیں اور کردار کا ایک ہی رخ پیش کیا جاتا ہے اس لئے چند جملوں میں یا ایک پیرا گراف میں اس کردار کی پوری زندگی کا نقشہ پیش کر دیا جاتا ہے۔

مکالمہ:

کرداروں کی آپسی گفتگو مکالمہ کہلاتی ہے، مکالمے کردار کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں، کردار جس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کی حیثیت و مرتبہ کی مناسبت سے مکالمے ادا کئے جاتے ہیں، مکالمے غیر فطری نہ لگیں اس کا پورا خیال رکھا جاتا ہے اس میں بھی اختصار کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔

پس منظر یا زماں و مکاں:

مختصر افسانے میں پس منظر اور زماں و مکاں کا ہونا لازمی ہے۔ ہر کہانی کا کوئی پس منظر ضرور ہوتا ہے جو قصہ اور کرداروں کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ اختصار کے پیش نظر زماں و مکاں دونوں کا افسانے

میں بیک وقت ہونا ضروری ہے۔

اسلوب:

ہر افسانہ نگار کا اپنا اسلوب ہوتا ہے، اسلوب کا اچھا یا برا ہونا افسانے کی کامیابی اور ناکامی کی دلیل ہوتا ہے، افسانہ نگار کو اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے فقرے اور جملوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے اور مرکزی خیال کو ہی پیش نظر رکھا جاتا ہے، واقعہ اور کردار کو اسلوب کے ذریعہ ہی اُبھارا جاتا ہے۔

نقطہ نظر:

ہر افسانہ نگار زندگی کے متعلق اپنا ایک الگ نظریہ اور نقطہ نظر رکھتا ہے۔ جو اس کے افسانوں میں صاف نظر آتا ہے، جیسے راشد الخیری کے یہاں سماجی اصلاح، سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں رومانیت اور پریم چند کے افسانوں میں حقیقت نگاری پر زور دیا گیا ہے۔

مختصر افسانے کا ارتقاء

اردو میں مختصر افسانے کے ابتدائی نمونے بیسویں صدی کی ابتدا میں ملتے ہیں، باقاعدہ افسانے کا آغاز پریم چند سے ہوتا ہے، پریم چند نے افسانے کو فنی حیثیت عطا کی، وطن پرستی سماجی اصلاح اور دیہاتی زندگی کے مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ”سوزِ وطن“ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ سجاد حیدر یلدرم رومانی افسانہ نگار ہیں۔ نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں بھی رومانیت ملتی ہے۔

۱۹۳۶ء میں افسانوی مجموعے ”انگارے“ نے افسانوی ادب میں انقلاب پیدا کر دیا، ان افسانوں میں رومانیت سے بغاوت، حقیقت نگاری اور جنسی معاملات پر زور دیا گیا ہے، اس میں لکھنے

والے رشید جہاں، احمد علی، سجاد ظہیر اور محمود الظفر تھے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا، جس میں ادب برائے زندگی پر زور دیا گیا، افسانوں میں حقیقت نگاری اور مقصدیت جیسے موضوعات نے فروغ پایا، اس دور کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری اور ممتاز مفتی کے نام قابل ذکر ہیں اس کے بعد قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، ہاجرہ مسرور کے افسانوں نے بھی کافی مقبولیت حاصل کی۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا، اس کے بعد لکھنے والوں میں قاضی عبدالستار، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، اقبال متین، بلراج مین را، انور عظیم، اقبال مجید، سریندر پرکاش اور انور سجاد کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریم چند

منشی پریم چند ۱۸۸۰ء میں بنارس کے قریب لمبی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والدین نے دھنپت رائے نام رکھا۔ پریم چند کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ ان کی والدہ کا نام آنندی دیوی تھا۔ جب پریم چند آٹھ سال کے تھے ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ ۱۸۹۳ء میں جب آپ کے والد کا تبادلہ گورکھپور ہو گیا تو وہاں مشن اسکول میں چھٹے درجے میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۶ء میں کوننس کالج بنارس سے نویں جماعت پاس کی ۱۸۹۷ء میں چند ماہ بیمار رہ کر والد کا انتقال ہو گیا۔ ۱۸۹۸ء میں میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۸۹۹ء میں ایک پرائمری اسکول میں اٹھارہ روپے ماہوار پراسٹنٹ ماسٹر مقرر ہوئے۔ اسی دوران بی۔ اے۔ کیا پھر ہیڈ ماسٹر اور ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول ہوئے۔

پریم چند اردو میں جدید افسانے کے بانی اور بڑے افسانہ نگار ہیں۔ پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء سے شروع ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ ”دنیا کا سب سے انمول رتن“ رسالہ ”زمانہ“ کانپور میں ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ ان کے پانچ افسانوں کا مجموعہ ”سوز وطن“ ۱۹۰۸ء میں نواب رائے کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے افسانے حب الوطنی کے جذبہ سے بھرے ہونے کے سبب انگریزی حکومت نے اسے ضبط کر لیا۔ آپ بعد میں پریم چند کے قلمی نام سے لکھنے لگے۔

پریم چند نے افسانے اور ناول کی دنیا میں بہت بلند مقام حاصل کیا ان کی تصانیف میں انسانی زندگی کی سچی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے افسانے کو حقیقت سے قریب کیا۔ عوامی زندگی کی ترجمانی کی۔ محنت کش طبقہ کے جذبات و احساسات اور ان کے مسائل کو پیش کیا۔ پریم چند نے پہلی بار

ہندوستان کی دیہاتی زندگی کو موضوع بنایا۔ دیہات میں مہاجن، زمیندار اور پروہت کس طرح کسانوں کا خون چوس رہے تھے یعنی طبقاتی کشمکش، رسم و رواج کی پابندی، عورتوں کی مظلومی چھو اچھوت، مزدوروں کی دشواریاں یعنی پسماندہ طبقے کے مسائل کو پریم چند نے پیش کر کے سماجی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔

پریم چند انسانی نفسیات کے نباض تھے ان کے افسانوں میں نہ صرف واقعات حقیقی زندگی کے معلوم ہوتے ہیں بلکہ کردار بھی جیتے جاگتے نظر آتے ہیں اصلی زندگی میں جن سے ہم روز بروز ہوتے ہیں۔

پریم چند کو زبان پر قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے سادہ سلیس، شگفتہ اور رواں زبان استعمال کی۔ اسی لیے مکالمے بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔ قاتل کی ماں، زیور کا ڈبہ، گلی ڈنڈا، عمید گاہ، نمک کا داروغہ، قول کا پاس، کفن ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔ اور پریم پچھسی، پریم بتیسی، خواب و خیال، خاک پروانہ، آخری تحفہ، زادراہ، اور واردات ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔

انہوں نے ایک درجن سے زیادہ ناول لکھے ہیں ان کے ناولوں میں بازارِ حسن، چوگانِ ہستی، میدانِ عمل، گوشہٴ عافیت، بیوہ، غبن، گودان بہت مشہور ہیں۔

نصاب میں شامل ”قول کا پاس“ افسانہ راجپوتوں کی سچائی، بہادری اور فرض شناسی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانہ کے ذریعہ پریم چند نے بچوں میں قول کے پاس کے جذبے کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

قول کا پاس

اکبر بادشاہ مغلوں کا بہت مشہور بادشاہ گزرا ہے۔ اس نے لڑائیاں لڑ کر ہندوستان کا بہت سا حصہ فتح کر لیا تھا۔ ایک راجپوتانہ رہ گیا تھا، اکبر نے چاہا کہ اسے بھی فتح کر لے اور وہاں بھی سلطنت کرے۔ یہ ارادہ کر کے راجپوتانہ پر فوج کشی کی۔ راجپوت اپنا ملک بچانے کے لیے لڑے تو بڑی بہادری سے، مگر آخر کار ان کے پاؤں اُکھڑ گئے، راجپوتوں کا سردار رانا پرتاپ سنگھ اپنے بال بچوں کو لے کر کسی جنگل میں جا چھپا۔

راجپوتوں کے ایک سردار کا نام رگھوپت تھا۔ یہ بڑا بہادر اور جری تھا۔ اس نے کچھ لوگ اپنی فوج میں داخل کر لیے تھے اور ان کو ساتھ لے کر لڑا کرتا تھا، اس نے بہادری میں اپنا ایسا نام پیدا کر لیا تھا کہ بڑے بڑے مغل اس کا نام سن کر گھبرا جاتے تھے، اکبر کے سپاہیوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس کو پکڑ لیں مگر وہ ایک جگہ کب رہتا تھا جو اسے پکڑ سکتے۔

رگھوپت سنگھ کی ایک بیوی تھی اور ایک اکلوتا بیٹا تھا۔ جب وہ اپنے دشمنوں سے لڑنے کو گھر سے نکلا تھا اس کا بیٹا بہت بیمار تھا۔ لیکن اس نے نہ تو اپنے بیمار بچے کا خیال کیا، نہ بیوی کا۔ مغلوں سے لڑنے کو گھر سے نکل کھڑا ہوا، ہاں کبھی کبھی چوری چھپے سے کسی کو گھر بھیج دیتا تھا اور بیوی بچے کی خبر منگوا لیا کرتا تھا۔ رگھوپت سنگھ کو پکڑنے کو اکبر بادشاہ نے بہت سی فوج بھیجی مگر وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ پھر بادشاہ نے اس کے گھر پر پہرہ بٹھا دیا۔ اکبر کا خیال تھا کہ کسی دن رگھوپت سنگھ اپنے بال بچے سے ملنے کو ضرور گھر آئے گا، بس اسی دن سپاہی اس کو پکڑ لیں گے۔ ادھر کسی نے رگھوپت سنگھ کو خبر کر دی کہ تیرا بیٹا گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہے، چل کر اُسے دیکھ لے۔

یہ سن کر رگھوپت سنگھ، بہت گھبرایا، سورج ڈوب رہا تھا، جنگل میں سفر کرنے کا وقت تو نہیں تھا مگر رگھوپت نے سوچا کہ ”اگر میں نے ذرا بھی دیر کی تو شاید میں لڑکے کی صورت بھی نہ دیکھ سکوں، اسی وقت چلنا چاہیے۔“ رگھوپت سنگھ اسی وقت چلنے کو تیار ہو گیا۔ جب رگھوپت سنگھ گھر پہنچا تو دروازے پر اکبر بادشاہ کے سپاہیوں میں سے ایک پہرہ دار نے کہا ”بادشاہ کا حکم ہے کہ تم جہاں ملو پکڑ لیے جاؤ“ رگھوپت سنگھ نے کہا ”میرا لڑکا مر رہا ہے، اسے دیکھنے آیا ہوں، ذرا دیر کے لیے مجھے اندر چلا جانے دو، ابھی دیکھ کر لوٹ آتا ہوں۔ اس وقت جو جی چاہے کر لینا۔ میں راجپوت ہوں، جھوٹ ہرگز نہ بولوں گا۔“

اس پہرہ والے سپاہی نے کہا ”دیکھ آؤ۔“ جب رگھوپت سنگھ گھر میں گیا تو دیکھا کہ لڑکا بے چین ہو رہا ہے اور بیوی فکر کے مارے بے حال ہو رہی ہے۔ میاں کو دیکھ کر بیوی کی ڈھارس بندھی۔ رگھوپت سنگھ نے بچے کو پیار کیا اور دوا کی تدبیریں بتائیں۔ پھر اپنی بیوی سے کہا۔ ”دروازے پر سپاہی کھڑا ہے، میں کہہ آیا ہوں کہ میں قید ہونے کو ابھی واپس آتا ہوں۔“ بیوی نے کہا۔ ”ایسا نہ کرو، دوسرے دروازے سے نکل جاؤ“ رگھوپت نے کہا ”یہ مجھ سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں قول دے چکا ہوں، اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے پر آیا اور سپاہی سے کہنے لگا ”لو میں آ گیا اب مجھے پکڑ کر جہاں چاہو لے چلو۔“ سپاہی نے کہا ”تمہیں پکڑنے کو میرا جی نہیں چاہتا، تم بھاگ جاؤ۔“ رگھوپت نے کہا ”بہت بہتر تم نے اس وقت میری مدد کی ہے، جب تم پر برا وقت آئے گا تو میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔ یہ کہہ کر رگھوپت آگے بڑھا اور غائب ہو گیا۔

اس بات کو تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ مغلوں کا ایک افسر کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر آ پہنچا۔ پہرے والے سے کہا ”ہم نے سنا ہے رگھوپت ادھر آیا ہے“ پہرے والے نے سچ سچ کہہ دیا کہ ”رگھوپت سنگھ اپنے بیمار بیٹے کو دیکھنے آیا تھا اور میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی“ یہ سن کر افسر نے پہرہ دار کو قید

کر لیا۔ رگھوپت سنگھ کو بھی سپاہی کے قید ہونے کی خبر مل گئی وہ اسی وقت واپس آیا اور آ کر مغل افسر کے پاس کھڑا ہو گیا اور کہا کہ میں رگھوپت ہوں۔ میں واپس آ گیا ہوں۔ مجھے پکڑ لو اور اس بے گناہ قیدی کو چھوڑ دو۔“ افسر نے رگھوپت کو پکڑ لیا اور قید خانے میں ڈال دیا لیکن سپاہی کو نہ چھوڑا، افسر نے دونوں کے قتل کرنے کا حکم دیا۔

دوسرے دن سپاہی رگھوپت اور پہرہ دار کو میدان میں لائے کہ ان کو قتل کیا جائے۔ دونوں کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ مغل افسر نے جلا دے کہا کہ دونوں کی گردنیں اڑا دو۔ جلا دے تلوار اٹھائی ہی تھی کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ لوگوں نے دیکھا تو اکبر بادشاہ اپنے افسروں کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ سب نے جھک کر سلام کیا۔ اکبر گھوڑے پر سے اتر پڑا اور کہنے لگا ”رگھوپت کی گرفتاری کا پورا حال مجھ کو معلوم ہو چکا ہے۔“ پھر پہرہ دار سے کہا ”ہر بھلے آدمی کا دل دوسروں کا دکھ دیکھ کر پگھل جاتا ہے، مجھے معلوم ہے کہ اس راجپوت کی تکلیف دیکھ کر تمہارا دل بھرا آیا تھا۔ اس لیے تم نے اس کو چھوڑ دیا تھا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے بھی تو میں نے معاف کیا۔ مجھے ایسے ہی سپاہی چاہیے۔ جو اپنے بادشاہ سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہے۔“ یہ سنتے ہی پہرہ دار خوشی سے پھولانہ سما یا۔

پھر اکبر نے رگھوپت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”مجھے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ بہادر راجپوت بات کے اتنے ذہنی ہوتے ہیں۔ تمہاری بہادری اور ایفائے وعدہ سے میں بہت خوش ہوا، میں نے تم کو بھی چھوڑا۔“ رگھوپت سنگ گھٹنوں کے بل زمین پر جھک گیا اور کہا ”آپ جس رگھوپت کو اتنی مشکل سے بھی جیت نہ سکتے۔ آج اپنی دریا دلی دکھا کر آپ نے اسے جیت لیا۔ آپ بہادروں کی وقعت کرانا جانتے ہیں۔ اب میں کبھی آپ کا دشمن ہو کر تلوار نہ اٹھاؤں گا۔“

جو آدمی اپنے وعدے کے پکے ہوتے ہیں اور سچائی پر جسے رہتے ہیں اور دوسرے کے دکھ میں مدد کرتے ہیں خدا ہمیشہ ان کی مدد کرتا ہے۔

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	لفظ
جیت	فتح
حملہ، چڑھائی	فوج کشی
جنگجو، بہادر	جری
وعدہ	قول
فراخ دلی	دریادلی
عزت	وقعت

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ پریم چند کا اصلی نام کیا تھا؟
- ۲۔ راجپوتوں کے سردار کا نام کیا تھا؟
- ۳۔ اکبر کس خاندان کا بادشاہ تھا؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ اکبر رگھوپت کی کس بات سے متاثر ہو گیا۔
- ۵۔ پریم چند کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام بتائیے۔
- ۶۔ اکبر نے رگھوپت کا دل کس طرح جیت لیا؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ پریم چند کے حالات زندگی اور ان کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کیجیے۔
- ۸۔ قول کا پاس ”سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔“

سریندر پرکاش

سریندر پرکاش اوبرائے نام ۱۹۳۰ء میں شہر لائل پور فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں والدین کے ساتھ دہلی پہنچے، تلاش معاش میں سرگرداں رہے۔ معمولی درجہ کی ملازمتیں بھی کیں۔ فرضی ناموں سے کہانیاں اور ناول لکھے۔ ریڈیو میں وقتی طور پر اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ بی۔ اے۔ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ممبئی کی ایک فلم کمپنی سے وابستہ ہوئے۔ وہ زمانہ ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ تھا لیکن انہوں نے اپنی الگ راہ نکالی۔ ان کے افسانوں میں تجریدی اور علامتی عنصر نمایاں ہے۔ ان کے افسانے دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، سمندر، میدان، پگڈنڈیاں، آتش دان، دیواریں اور ان پر لگی تصویریں ان کے علامتی کردار کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔

سریندر پرکاش کا پہلا افسانہ ”دیوتا“ لاہور کے ایک ہفتہ وار ”پارس“ میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم“ ۱۹۶۸ء میں دوسرا مجموعہ ”برف پر مکالمہ“ ۱۹۸۱ء میں تیسرا مجموعہ ”بازگوئی“ ۱۹۸۸ء میں اور چوتھا ”حاضر حال جاری“ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ سریندر پرکاش کو مجموعہ ”بازگوئی“ پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

سریندر پرکاش نے جدید دور کے انسانی مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ علامتوں کے استعمال نے ان کے افسانوں میں معنویت پیدا کر دی۔ انھیں زبان و بیان، پر قدرت حاصل ہے۔ سادہ سلیس اور رواں زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے ان کے گہرے مشاہدے کا پتہ چلتا ہے، واقعات کا گہرا سمندر ہے جو اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان کے افسانوں کے تانے بانے خواب اور حقیقت کے بیچ کی کیفیتوں سے تیار ہوتے ہیں۔ اکثر چیزیں اپنے روایتی تصور

سے ہٹ کر سامنے آتی ہیں اور حیرت و استعجاب کہانی کی دلچسپی کو بنائے رکھتے ہیں۔
سریندر پرکاش کے افسانوں میں لفظوں کے پیچھے ایک جہانِ معنی آباد نظر آتا ہے۔ کردار زندہ اور متحرک نظر آتے ہیں۔ ان کی عبارت آرائی گہرے غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کا مشہور افسانہ ”بجوکا“ ان کے افسانوی مجموعے ”بازگونی“ میں شامل ہے۔ یہ اس قدر مقبول ہوا کہ ”بجوکا“ کے عنوان سے اردو کے علاوہ بعد میں بعض دیگر ہندوستانی زبانوں میں کئی افسانے لکھے گئے۔ ”بجوکا“ افسانے میں ایک پیغام پوشیدہ ہے کہ جو افراد اور قومیں اپنی ملکیت اور پیداوار کی حفاظت خود نہیں کرتیں بلکہ یہ کام دوسروں کو سونپ دیتی ہیں تو نہ صرف جاندار بلکہ بے جان ذمہ داروں میں بھی اس ملکیت یا پیداوار میں سے اپنا حصہ لینے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سبق میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح محنت کا پھل ہوری کو ملتا ہے تو بجوکا بھی اپنی محنت کا پھل پانے کا حقدار ہے۔ اس لیے اپنی ملکیت کی حفاظت خود کرنی چاہیے۔

بجوکا

پریم چند کی کہانی کا ہوری اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اس کی پلکوں اور بھوؤں تک کے بال سفید ہو گئے تھے، کمر میں خم پڑ گیا تھا اور ہاتھوں کی نسلیں سانولے کھر درے گوشت میں سے اُبھر آئی تھیں۔

اس اثنا میں اُس کے ہاں دو بیٹے ہوئے تھے، جو اب نہیں رہے۔ ایک گنگا میں نہا رہا تھا کہ ڈوب گیا اور دوسرا پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ پولیس کے ساتھ اس کا مقابلہ کیوں ہوا، اس میں کچھ ایسی بتانے کی بات نہیں جب بھی کوئی آدمی اپنے وجود سے واقف ہوتا ہے اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے تو اُس کا پولیس کے ساتھ مقابلہ ہو جانا قدرتی ہو جاتا ہے بس ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا تھا اور بوڑھے ہوری کے ہاتھ ہل کے ہتھے کو تھامے ہوئے ایک بار ڈھیلے پڑے، ذرا کانپے اور پھر ان کی گرفت اپنے آپ مضبوط ہو گئی اس نے بیلوں کو ہانک لگائی اور ہل کا پھل زمین کا سینہ چیرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اُن دونوں بیٹوں کی بیویاں تھیں اور آگے ان کے پانچ بچے۔ تین گنگا میں ڈوبنے والے کے اور دو پولیس مقابلے میں مارے جانے والے کے۔ اب ان سب کی پرورش کا بار ہوری پر آن پڑا تھا، اور اس کے بوڑھے جسم میں خون زور سے گردش کرنے لگا تھا۔

اس دن آسمان سورج نکلنے سے پہلے کچھ زیادہ ہی سرخ تھا اور ہوری کے آنگن کے کنویں کے گرد پانچوں بچے ننگ دھڑنگ بیٹھے نہا رہے تھے۔ اس کی بڑی بہو کنویں سے پانی نکال نکال کر ان پر باری باری اُنڈیلیتی جا رہی تھی اور وہ اچھلتے ہوئے اپنا پنڈا ملتے پانی اُچھال رہے تھے۔ چھوٹی بہو بڑی بڑی روٹیاں بنا کر چنگیری میں ڈال رہی تھی اور ہوری اندر کپڑے بدل کر پگڑی باندھ رہا تھا۔ پگڑی باندھ کر

اس نے طاقے میں رکھے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سارے چہرے پر لکیریں پھیل گئی تھیں۔ اس نے قریب ہی لٹکی ہوئی ہنومان جی کی چھوٹی سی تصویر کے سامنے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا اور پھر دروازے میں سے گزر کر باہر آنگن میں آ گیا۔

”سب تیار ہیں۔؟“ اس نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

”ہاں باپو۔“ سب بچے ایک ساتھ بول اٹھے۔ بہوؤں نے اپنے سروں پر پلو درست کیے اور ان کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ ہوری نے دیکھا ابھی کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ سب جھوٹ بول رہے تھے۔ اس نے سوچا یہ جھوٹ ہماری زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے، اگر بھگوان نے ہمیں جھوٹ جیسی نعمت نہ دی ہوتی تو لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگ جاتے۔ ان کے پاس جینے کا کوئی بہانہ نہ رہ جاتا۔ ہم پہلے جھوٹ بولتے ہیں اور پھر اسے سچ ثابت کرنے کی کوشش میں دیر تک زندہ رہتے ہیں۔

ہوری کے پوتے، پوتیاں اور بہوئیں۔ ابھی ابھی بولے ہوئے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں پوری تندہی سے جٹ گئیں۔ جب تک ہوری نے ایک کونے میں پڑے کٹائی کے اوزار نکالے۔ اور اب وہ سچ مچ تیار ہو چکے تھے۔

ان کا کھیت لہلہا اٹھا تھا۔ فصل پک گئی تھی اور آج کٹائی کا دن تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ سب بڑے چاؤ سے جلد از جلد کھیت پر پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ انہوں نے دیکھا سورج کی سنہری کرنوں نے سارے گھر کو اپنے جادو میں جکڑ لیا ہے۔

ہوری نے انکو چھا کندھے پر رکھتے ہوئے سوچا۔ کتنا اچھا ہے آپہنچا ہے۔ نہ اہلمد کی دھونس، نہ بینے کا کھٹکا، نہ انگریزی کی زور زبردستی اور نہ زمیندار کا حصہ۔ اس کی نظروں کے سامنے ہرے ہرے خوشے جھوم اٹھے۔

”چلو باپو“ اس کے بڑے پوتے نے اس کی انگلی پکڑ لی، باقی بچے اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ

گئے۔ بڑی بہونے کوٹھری کا دروازہ بند کیا اور چھوٹی بہونے روٹیوں کی پوٹلی سر پر رکھی۔
بیر بجرنگی کا نام لے کر سب باہر کی چار دیواری والے دروازے میں نکل کر گلی میں آگئے اور پھر
دائیں طرف مڑ کر اپنے کھیت کی طرف بڑھنے لگے۔

گاؤں کی گلیوں، گلیاروں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ لوگ کھیتوں کو آ جا رہے تھے، سب
کے دلوں میں مسرت کے انار پھوٹے محسوس ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھیں پکی فصلیں دیکھ کر چمک رہی
تھیں۔ ہوری کو لگا جیسے زندگی کل سے آج ذرا مختلف ہے اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آتے ہوئے بچوں کی
طرف دیکھا۔ وہ بالکل ویسے ہی لگ رہے تھے جیسے کسان کے بچے ہوتے ہیں۔ سانولے مریل سے۔ جو
جیب گاڑی کے پہیوں کی آواز اور موسم کی آہٹ سے ڈر جاتے ہیں۔ بہوئیں ویسی ہی تھیں جیسی کہ غریب
کسان بیوہ عورتیں ہوتی ہیں۔۔۔ چہرے گھونگھٹوں میں چھپے ہوئے اور لباس کی ایک ایک سلوٹ میں غریبی
جوؤں کی طرح چھپی بیٹھی۔

وہ سر جھکا کر پھر آگے بڑھنے لگا۔ گاؤں کے آخری مکان سے گزر کر آگے کھلے کھیت تھے۔ قریب
ہی رہٹ خاموش کھڑا تھا، نیم کے درخت کے نیچے ایک کتا بے فکری سے سویا ہوا تھا، دور طیلے میں کچھ
گائیں۔ بھینسیں اور بیل چارہ کھا کر پھنکار رہے تھے۔ سامنے دور دور تک لہلہاتے ہوئے سنہری کھیت
تھے۔ ان سب کھیتوں کے بعد، ذرا دور، جب یہ سب کھیت ختم ہو جائیں گے اور پھر، چھوٹا سا نالہ پار کر
کے الگ تھلگ ہوری کا کھیت تھا۔ جس میں جھونا پک کر انگریزیاں لے رہا تھا وہ سب پگڈنڈیوں پر چلتے
ہوئے دور سے ایسے لگ رہے تھے جیسے رنگ برنگے کیڑے گھاس پر رینگ رہے ہوں۔ وہ سب کھیت کی
طرف جا رہے تھے جس کے آگے تھل تھا۔ دور دور پھیلا ہوا، جس میں کہیں ہریالی نظر نہ آتی تھی بس تھوڑی
بے جان مٹی تھی جس میں پاؤں رکھتے ہی دھنس جاتا تھا اور مٹی یوں بھر بھری ہو گئی تھی جیسے ان کے دونوں
بیٹوں کی ہڈیاں چتا میں جل کر پھول بن گئی تھیں اور پھر ہاتھ لگاتے ہی ریت کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ وہ

تھل دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ہوری کو یاد آیا پچھلے پچاس برسوں میں وہ دو ہاتھ آگے بڑھ آیا تھا۔ ہوری چاہتا تھا۔ جب تک بچے جوان ہوں وہ تھل اس کے کھیت تک نہ پہنچے۔ اور تب تک وہ خود کسی تھل کا حصہ بن چکا ہوگا۔

پگڈنڈیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور اس پر ہوری اور اس کے خاندان کے لوگوں کے حرکت کرتے ہوئے ننگے پاؤں.....

سورج آسمان کی مشرقی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ رہا تھا چلتے چلتے ان کے پاؤں مٹی سے اٹ گئے تھے۔ کئی ارد گرد کے کھیتوں میں لوگ کٹائی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ آتے جاتے کو رام رام کہتے اور پھر کسی انجانے جوش اور ولولے کے ساتھ ٹہنیوں کو درانتی سے کاٹ کر ایک طرف رکھ دیتے۔

انہوں نے باری باری نالہ پار کیا۔ نالے میں پانی نام کو بھی نہ تھا بہنے کو۔ اندر کی ریت ملی مٹی بالکل خشک ہو چکی تھی اور اس پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے تھے۔ وہ پانی کے پاؤں کے نشان تھے۔ اور سامنے لہلہاتا ہوا کھیت نظر آ رہا تھا۔ سب کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ فصل کٹے گی تو ان کا آنگن پھوس سے بھر جائے گا اور کوٹھڑی اناج سے، پھر کھٹیا پر بیٹھ کر بھات کھانے کا مزہ آئے گا۔ کیا ڈکاریں آئیں گی پیٹ بھر جانے کے بعد۔ ان سب نے ایک ہی بار سوچا۔

اچانک ہوری کے قدم رُک گئے۔ وہ سب بھی رُک گئے۔ ہوری کھیت کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب کبھی ہوری اور کبھی کھیت کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ہوری کے جسم میں جیسے بجلی کی سی پھرتی پیدا ہوئی، اس نے چند قدم آگے بڑھ کر بڑے جوش سے آواز لگائی۔

”ابے کون ہے...ے...ے؟“

اور پھر سب نے دیکھا ان کے کھیت میں کچی ہوئی فصل میں کچھ بے چینی کے آثار تھے۔ اب وہ

سب ہوری کے پیچھے تیز تیز قدم بڑھانے لگے۔ ہوری پھر چلا یا۔

”ابے کون ہے رے۔ بولتا کیوں نہیں۔ کون فصل کاٹ رہا ہے میری۔؟“

مگر کھیت میں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب وہ قریب آچکے تھے اور کھیت کے دوسرے کونے پر درانتی چلنے کی سڑاپ سڑاپ کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ سب قدرے سہم گئے۔ پھر ہوری نے ہمت سے لکارا۔

”کون ہے۔ بولتا کیوں نہیں؟“ اور اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی سونت لی اچانک کھیت کے

پر لے حصے میں سے ایک ڈھانچہ سا بھرا اور جیسے مسکرا کر انھیں دیکھنے لگا ہو۔

”میں ہوں ہوری کا کا۔ بجو کا!“ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی فضا میں ہلاتے ہوئے

جواب دیا۔

سب کی مارے خوف کے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ ان کے رنگ زرد پڑ گئے اور ہوری کے ہونٹوں پر گویا سفید پیڑی سی جم گئی۔ کچھ دیر کے لیے وہ سب سکتے میں آگئے اور بالکل خاموش کھڑے رہے۔ وہ کچھ دیر کتنی تھی؟ ایک پل، ایک صدی یا پھر ایک یگ۔ اس کا ان میں سے کسی کو اندازہ نہ ہوا۔ جب تک کہ انھوں نے ہوری کی غصے سے کا پتی ہوئی آواز نہ سنی انھیں اپنی زندگی کا احساس نہ ہوا۔

”تم..... بجو کا..... تم۔ ارے تم کو تو میں نے کھیت کی نگرانی کے لیے بنایا تھا۔ بانس کی پھانکوں

سے اور تم کو اس انگریز شکاری کے کپڑے پہنائے تھے جس کے شکار میں میرا باپ ہانکا لگا تا تھا اور وہ

جاتے ہوئے خوش ہو کر اپنے پھٹے ہوئے خاکی کپڑے میرے باپ کو دے گیا تھا۔ تیرا چہرا میرے گھر کی

بے کار ہانڈی سے بنا تھا اور اس پر اسی انگریز شکاری کا ٹوپا رکھ دیا تھا۔ ارے تو بے جان پتلا میری فصل

کاٹ رہا ہے؟“

ہوری کہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور بجو کا بدستور ان کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ جیسے اس پر

ہوری کی کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچے انہوں نے دیکھا۔ فصل ایک چوتھائی کے قریب کٹ چکی ہے۔ اور بجو کا اس کے قریب درانتی ہاتھ میں لیے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ سب حیران ہوئے کہ اس کے پاس درانتی کہاں سے آگئی وہ کئی مہینوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بے جان بجو کا دونوں ہاتھوں سے خالی کھڑا رہتا تھا۔ مگر آج.... وہ آدمی لگ رہا۔ گوشت پوست کا ان جیسا آدمی یہ منظر دیکھ کر ہوری تو جیسے پاگل ہوا اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ مگر بجو کا تو اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا البتہ ہوری اپنے ہی زور کی مار کھا کر دور جا کر۔ سب لوگ چیختے ہوئے ہوری کی طرف بڑھے۔ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب نے اسے سہارا دیا اور اس نے خوفزدہ ہو کر بجو کا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو..... تو مجھ سے بھی طاقتور ہو چکا ہے بجو کا! مجھ سے...؟ جس نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ اپنی فصل کی حفاظت کے واسطے۔“

بجو کا حسب معمول مسکرا رہا تھا، پھر بولا۔ ”تم خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہو ہوری کا کا، میں نے تو صرف اپنے حصے کی فصل کاٹی ہے۔ ایک چوتھائی۔“

”لیکن تم کو کیا حق ہے میرے بچوں کا حصہ لینے کا۔ تم کون ہوتے ہو۔“

”میرا حق ہے ہوری کا کا۔ کیوں کہ میں ہوں۔ اور میں نے اس کھیت کی حفاظت کی ہے۔“

”لیکن میں نے تمہیں بے جان سمجھ کر یہاں کھڑا کیا تھا اور بے جان چیز کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ یہ

تمہارے ہاتھ میں درانتی کہاں سے آگئی؟“

بجو کا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ تم بڑے بھولے ہو ہوری کا کا۔ خود ہی مجھ سے باتیں کر رہے

ہو۔ اور پھر مجھ کو بے جان سمجھتے ہو۔؟“

”لیکن تم کو یہ درانتی اور زندگی کس نے دی۔؟ میں نے تو نہیں دی تھی!“

”یہ مجھے آپ سے آپ مل گئی۔ جس دن تم نے مجھے بنانے کے لیے بانس کی پھانکیں چیری تھیں،

انگریز شکاری کے پھٹے پرانے کپڑے لائے تھے۔ گھر کی بے کار ہانڈی پر میری آنکھیں، ناک، کان اور منہ بنایا تھا۔ اسی دن ان سب چیزوں میں زندگی کلبلا رہی تھی اور یہ سب مل کر میں بنا اور میں فصل پکنے تک یہاں کھڑا رہا اور ایک درانتی میرے سارے وجود میں سے آہستہ آہستہ نکلتی رہی۔ اور جب فصل پک گئی وہ درانتی میرے ہاتھ میں تھی لیکن میں نے تمہاری امانت میں خیانت نہیں کی۔ میں آج کے دن کا انتظار کرتا رہا۔ اور آج جب تم اپنی فصل کاٹنے آئے ہو۔ میں نے اپنا حصہ کاٹ لیا۔ اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے؟“ بجو کا نے آہستہ آہستہ سب کہا۔ تاکہ ان سب کو اس کی بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ سازش ہے۔ میں تمہیں زندہ نہیں مانتا، یہ سب چھلا وا ہے۔ میں پنچایت سے اس کا فیصلہ کراؤں گا۔ تم درانتی پھینک دو۔ میں تمہیں ایک تنکا بھی لے جانے نہیں دوں گا۔“

ہوری چیخا، اور بجو کا نے مسکراتے ہوئے درانتی پھینک دی۔

گاؤں کی چوپال پر پنچایت لگی۔ پنچ اور سر پنچ سب موجود تھے۔ ہوری اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ پنچ میں بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ مارے غم کے مرجھایا ہوا تھا۔ اس کی دونوں بہوئیں دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی تھیں اور بجو کا کا انتظار تھا۔ آج پنچایت نے اپنا فیصلہ سنانا تھا۔ مقدمے کے دونوں فریق اپنا بیان دے چکے تھے۔

آخر دور سے بجو کا خراماں خراماں آتا ہوا دکھائی دیا۔ سب کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ وہ ویسے ہی مسکراتا ہوا آ رہا تھا، جیسے ہی وہ چوپال میں داخل ہوا، سب غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے سر تعظیماً جھک گئے۔ ہوری یہ تماشہ دیکھ کر تڑپ اٹھا سے لگا جیسے بجو کا نے سارے گاؤں کے لوگوں کا ضمیر خرید لیا ہے، پنچایت کا انصاف خرید لیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تیز پانی میں بے بس آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

آخر سر پنچ نے اپنا فیصلہ سنایا، ہوری کا سارا وجود کانپنے لگا۔ اس نے پنچایت کے فیصلے کو قبول

کرتے ہوئے فصل کا چوتھائی حصہ بجوکا کو دینا منظور کر لیا اور پھر کھڑا ہو کر اپنے پوتوں سے کہنے لگا:

”سنو۔ یہ شاید ہماری زندگی کی آخری فصل ہے۔ ابھی تھل کھیت سے کچھ دوری پر ہے۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں، اپنی فصل کی حفاظت کے لیے پھر کبھی بجوکا نہ بنانا۔ اگلے برس جب ہل چلیں گے۔ بیج بویا جائے گا اور بارش کا امرت کھیت میں سے کونپلوں کو جنم دے گا۔ تو مجھے ایک بانس پر باندھ کر کھیت میں کھڑا کر دینا۔ بجوکا کی جگہ پر میں تب تک تمہاری فصلوں کی حفاظت کروں گا۔ جب تک تھل آگے بڑھ کر کھیت کی مٹی کونگل نہیں لے گا اور تمہارے کھیتوں کی مٹی بھر بھری نہیں ہو جائے گی۔ مجھے وہاں سے ہٹانا نہیں۔ وہیں رہنے دینا۔ تاکہ جب لوگ دیکھیں تو انہیں یاد آئے کہ بجوکا نہیں بنانا۔ کہ بجوکا بے جان نہیں ہوتا۔ آپ سے آپ اُسے زندگی مل جاتی ہے اور اُس کا وجود اُسے درانتی تھا دیتا ہے اور اُس کا فصل کی ایک چوتھائی پر حق ہو جاتا ہے۔“

ہوری نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کھیت کی طرف بڑھا۔ اس کے پوتے اور پوتیاں اس کے پیچھے تھے اور پھر اس کی بہنیں اور ان کے پیچھے گاؤں کے دوسرے لوگ سر جھکائے ہوئے چل رہے تھے۔

کھیت کے قریب پہنچ کر ہوری گرا اور ختم ہو گیا۔ اس کے پوتے، پوتوں نے اسے ایک بانس سے باندھنا شروع کیا۔ اور باقی کے سب لوگ یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ بجوکا نے اپنے سر پر رکھا شکاری ٹوپا اتار کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنا سر جھکا دیا۔

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

لفظ	معانی
بجواکا	بانس یا درخت کی شاخوں سے بنا ہوا ایک ڈھانچا جسے ٹوپی اور قمیض یا کرتا پہنا کر کھیت میں آدمی کی طرح کھڑا کر دیتے ہیں۔
خم پڑنا	جھک جانا
اشنا	دوران، بیچ
وجود	ہستی، مراد سماجی حیثیت
پرورش کا بار	پالنے پوسنے کی ذمہ داری
خون کی گردش	رگوں میں خون کا دوران
پنڈا	بدن، جسم
چنگیری	روٹیاں رکھنے کی ڈلیا
تن دہی	پھرتی، مستعدی
اہلمد	(صحیح لفظ: اہل مد) عدالت میں پیشکار کا محرر
بیر (ویر)	بہادر
بیر بجزنگی	ہنومان جی کا ایک لقب
جھونا	سونہ کے ساتھ بہ طور تابع مہمل استعمال ہوتا ہے۔
	مثلاً: خدا سونا جھونا پہننا نصیب کرے۔ یہاں مراد ہے: بالیوں

میں اناج کے سونے جیسے دانے	تھل
ریگستان	بدستور
پہلے کی طرح	چھلاوا
دھوکا، سایہ جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جائے	

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ سریندر پرکاش کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
- ۲۔ ہوری کس ناول کا کردار ہے؟
- ۳۔ فصل پک جانے پر ہوری، خوش کیوں تھا؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ سریندر پرکاش کے پہلے افسانے کا نام کیا ہے؟ اور وہ کس رسالے میں شائع ہوا؟
- ۵۔ ’بجوکا‘ کسے کہتے ہیں؟
- ۶۔ ہوری نے اپنے گھر والوں کو کیا وصیت کی تھی؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ سریندر پرکاش کی سوانح حیات اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالے
- ۸۔ سبق ’بجوکا‘ کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

مکتوب نگاری: ایک تعارف

لغت میں خط، نوشتہ، نامہ، مراسلہ، رقعہ اور چٹھی کو مکتوب کے مترادف بتائے گئے ہیں۔ جس طرح دیگر علوم و فنون کے کچھ اصول اور تقاضے ہوتے ہیں اسی طرح مکتوب نگاری کے بھی چند ضابطے ہوتے ہیں جن کی طرف توجہ دے کر کوئی بھی مکتوب نگار عمدہ اور با اثر خط لکھ سکتا ہے، کیونکہ خط لکھنا بھی ایک فن ہے۔ جس طرح زندگی کے آداب مقرر ہیں اسی طرح مکتوب نگاری کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں جن کا دھیان مکتوب نگار کو رکھنا چاہیے مثلاً خط میں غیر ضروری باتیں شامل نہ ہوں، زبان صاف، سلیس اور رواں دواں ہو، خط کو گورکھ دھندلانا بنے دیا جائے، انداز بیان میں خلوص اور دل کشی ہو، ایک ہی بات کو بار بار نہ دہرایا جائے، کسی ایک پہلو کو بلا سبب طول نہ دیا جائے، خط میں ایسی باتیں ہرگز نہ لکھی جائیں جو مکتوب الیہ کی پریشانی کا سبب بن جائیں۔

خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے، جو شخص کسی کو خط لکھتا ہے اسے کاتب یا مکتوب نگار اور جسے خط لکھا جاتا ہے اُسے مکتوب الیہ یا مخاطب کہا جاتا ہے۔ زمانے کے نشیب و فراز کے ساتھ مکتوب نگاری کے طور طریق میں بھی تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ مکتوب نگاری کے فرسودہ اور روایتی طریقے کے تحت مکتوب نگار لمبے چوڑے القاب و آداب استعمال کرتا تھا جس کے سبب آدھا خط تو غیر ضروری اور رسمی باتوں ہی سے پُر ہو جاتا تھا۔ ایسے مکتوبات میں کاتب تصنیع اور بناوٹ سے بھرے جملے اور فقرے استعمال کرتا تھا۔ اس کے علاوہ مسجح نثر پر زیادہ زور دے کر اصل مقصد یا موضوع کو پس پشت ڈال دیا جاتا تھا۔ لیکن آگے چل کر اس طریقہ مکتوب نگاری کو ترک کر دیا گیا اور اب جو مکتوبات لکھے جانے لگے ان میں لمبے چوڑے القاب و آداب سے پرہیز اور مقفی اور مسجح نثر سے گریز کیا جانے لگا۔ مختصر القاب، عام فہم زبان اور صرف ضروری

امور کو ملحوظ رکھا جانے لگا۔ اس طرز کے موجد مرزا اسد اللہ خاں غالب تھے۔

خط عام طور پر تین قسم کے ہوتے ہیں (۱) نجی یا ذاتی (۲) کاروباری (۳) سرکاری جس طرح شعری و نثری اصناف کے اجزائے ترکیبی اور فنی لوازم ہوتے ہیں اسی طرح مکتوب نگاری کے لیے مندرجہ ذیل اجزائے ترکیبی لازمی ہیں:

- ۱۔ مکتوب نگار کا پتہ
- ۲۔ تاریخ ۳۔ القاب و آداب ۴۔ مضمون خط یعنی اصل مقصد ۵۔ خاتمہ
- ۶۔ مکتوب الیہ (مخاطب کا نام و پتہ)

مکتوب نگاری یوں تو شخصی اظہار کے زمرے میں آتی ہے لیکن مکتوب نگار بعض اوقات ایسی معلوماتی اور عالمانہ باتیں اپنے مخاطب یا مکتوب الیہ کو لکھ دیتا ہے جو اور کہیں نہیں ملتیں، تاہم اس طرح ایک شخصی اور ذاتی تحریریں پارے کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ بعض مفکرین نے اعلیٰ اور عمدہ قسم کے خطوط کو تخلیقی ادب کے ذیل میں شمار کیا ہے۔

اردو میں منظوم اور منشور دونوں قسم کے مکتوبات کی مثالیں ملتی ہیں۔ منظوم خطوط میں اس بے تکلفی اور بے ساختگی کا فقدان ہے جسے مکتوب نگاری کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ ادب اردو کے مطالعہ سے یہ علم ہوتا ہے کہ جس طرح شعرائے اردو کے تذکرے فارسی میں لکھے گئے اسی طرح شعراء و ادباء نے فارسی زبان میں خط لکھ کر اپنے علم و فضل و کمال کا سکہ جمانے کی کوشش کی، لیکن یہ سلسلہ تادیر قائم نہیں رہ سکا۔

اردو میں مکتوب نگاری کی روایت مرزا غالب کے پیش رو شعرا نے شروع کر دی تھی جن میں غلام غوث بے خبر، غلام امام شہید اور قنبل جیسے حضرات اور ان کے جیسے بعض معاصرین کے اسمائے گرامی شامل ہیں لیکن ان میں سے کسی کے بھی خطوط کا مجموعہ شائع نہیں ہوا، صرف نموناً ان کے مکتوبات کی چند نادر

تحریریں ادھر ادھر مل جاتی ہیں۔ اس لیے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے مکتوبات سے اردو میں باقاعدہ طور پر خطوط نویسی یا مکتوب نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ غالب نے مکتوب نگاری کو جو آب و تاب بخشی وہ آج بھی قائم ہے۔ انہوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا کر القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ ترک کیا جسے مستحسن قدم سمجھا گیا۔ ان کے خطوط ادبی، تاریخی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خطوط ”عود ہندی“، ”اردوئے معلیٰ“، ”خطوط غالب“ کے زیر عنوان منظر عام پر آچکے ہیں۔ غالب کی نثر کو پسند کرتے ہوئے علی گڑھ تحریک سے وابستہ حضرات یعنی سر سید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور شبلی نعمانی وغیرہ نے اردو میں مکتوباتی ادب کو پروان چڑھایا۔

مولانا محمد حسین آزاد، اکبر الہ آبادی، چودھری محمد علی رودلوی اور مولانا محمد علی جوہر نے جو خطوط اپنی ذاتی ضرورت کے تحت اپنے عزیز واقارب کو لکھے وہ اردو ادب میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد ایسے مکتوب نگار ہیں جن کے خطوط کے مجموعے شائع ہو کر مقبول عام ہوئے۔ اقبال کے خطوط کے مجموعے عالمانہ شان رکھتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد نے قلعہ احمد نگر کے قید خانے میں رہتے ہوئے جو خطوط حبیب الرحمن خاں شروانی کو لکھے ان کا مجموعہ بعنوان ”غبار خاطر“ شائع ہوا۔

مہدی افادی نے یوں تو اپنے کئی معاصرین کو خطوط لکھے، لیکن جو رومانی خطوط انہوں نے اپنی اہلیہ کے نام تحریر کیے وہ اردو نثر کا بہترین نمونہ قرار دیے جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق پروفیسر محمود شیرانی، پروفیسر آل احمد سرور اور عبدالماجد دریا آبادی جیسے ناقدین و محققین کے خطوط ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے معلومات کا خزانہ ہیں۔

منشی پریم چند، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، میراجی، سید سجاد ظہیر اور سعادت حسن منٹو وغیرہ کے خطوط دعوتِ فکر و عمل دیتے ہیں۔ قراۃ العین حیدر کے خطوط کے مجموعے ”اوراق پریشاں“ کو پڑھنے

پر ناول اور افسانے کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ مشہور ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر نے اپنی دو بیویوں یعنی صفیہ اختر اور خدیجہ اختر کے نام جو خطوط لکھے ان کا مجموعہ ”خاموش آواز“ کے عنوان سے مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال سے شائع ہوا۔ صفیہ اختر نے جو خطوط جاں نثار اختر کو لکھے ان کا مجموعہ ”زیر لب“ کے عنوان سے شائع ہوا۔

چونکہ خطوط یا مکتوبات کی ادبی اہمیت مسلم ہے، اس لیے بعض ادبی جریدوں اور اخبارات نے اردو سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے خطوط کو یکجا کر کے خصوصی شمارے ترتیب دیے۔ مشہور شاعر و ادیب ساغر نظامی نے اپنے اخبار ”ایشیا“ کا مکتبہ نمبر ”نگار نامہ“ کے عنوان سے شائع کیا۔ جسے تاریخی اہمیت و حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح ”نقوش“ (لاہور) کے مدیر محمد طفیل نے ”خطوط نمبر اور“ ”مکتبہ نمبر“ شائع کر کے اہم ادبی فریضہ انجام دیا۔ موجودہ عہد میں موقع بہ موقع اردو کے اہل قلم حضرات کے مکتبہ کے مجموعے شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے ادب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مرزا غالب

مرزا اسد اللہ خاں نام، اسد اور غالب تخلص۔ مرزا نوشہ لقب، اور نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ خطاب تھا۔ غالب کی ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو بمقام آگرہ ہوئی۔ غالب کا سلسلہ نسب ترکمانوں سے ملتا ہے۔ اس خاندان کے لوگ سلجوقی ترک کہلاتے تھے۔

غالب کے والد کا نام عبداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ غالب کے والد کے انتقال کے بعد ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کی ذمہ داری ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے اٹھائی۔ چند سالوں بعد غالب کے چچا کا بھی انتقال ہو گیا لہذا غالب باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ یہ بات مشہور ہے کہ غالب نے ایک نو مسلم پارسی عبدالصمد سے فارسی پڑھی تھی جب کہ ابتدائی تعلیم مولوی محمد معظم سے حاصل کی تھی۔ غالب کو چچا کی جاگیر کے معاوضے میں سات سو روپیہ سالانہ پنشن ملنے لگی۔ غالب آگرہ کو خیر باد کہہ کر دہلی چلے آئے۔ دہلی میں ان کی شادی مرزا الہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امرائے بیگم سے ہوئی۔ غالب اب مستقل طور پر دہلی کے ہو رہے۔ بہادر شاہ ظفر سے قربت ہو جانے کے سبب انھیں پچاس روپے ماہانہ پنشن ملنے لگی۔ غالب سیاحت پسند طبیعت کے مالک تھے۔ اس لیے انھوں نے کلکتہ، لکھنؤ اور رام پور وغیرہ مقامات کا سفر کیا۔ آخری عمر میں غالب سخت بیمار رہنے لگے اور دن بدن ان کی صحت گرتی گئی۔ آخر کار ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں آپ نے انتقال فرمایا۔ آپ کو درگاہ نظام الدین اولیاء کے قریب سپرد خاک کیا گیا۔

غالب کو یوں تو اوائل عمری سے ہی علم و ادب میں دلچسپی تھی لیکن مولانا فضل حق خیر آبادی سے ملاقات ہونے کے بعد ان کے مزاج میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں ان سے غالب کی شاعری کو پر لگ گئے۔

غالب نے فارسی اور اردو میں جو کلام یادگار چھوڑا اس کی بنیاد پر ان کا شمار عالمی ادب کے نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شعری تصانیف میں ”دیوان غالب“، کلیات نظم فارسی، مثنوی ”شانِ نبوت و ولادت“ اور ”چراغِ دیر“ وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

چونکہ غالب نابغہ روزگار شخصیت کے مالک تھے تاہم انھوں نے نظم کے ساتھ نثر کو بھی اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ ان کی نثر کا سرمایہ خطوط، تقاریر، دیباچوں اور رسالوں پر مشتمل ہے۔ لیکن بہ حیثیت نثر نگار خطوط نویسی کے حوالے سے انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔

غالب نے ۱۸۴۸ء کے آس پاس اردو میں خط لکھنا شروع کیا۔ خطوط نویسی کا سلسلہ ان کے انتقال تک جاری رہا۔ اردو سے قبل غالب فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ انھوں نے بیس اکیس برس تک اپنے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں، محسنوں اور بزرگوں کو جو خطوط اردو میں لکھے وہ نثر کا عظیم سرمایہ ہیں۔ ان کے خطوط کے مجموعے ”اردوئے معلیٰ“، ”عودِ ہندی“ اور ”خطوط غالب“ ادبی حلقوں میں حسنِ قبول حاصل کر چکے ہیں۔

غالب کے خطوط اس عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور تاریخی حالات کے آئینہ دار ہیں۔ یہ خطوط غالب کے دل و دماغ اور خیالات و رجحانات کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ انھیں زبان و بیان کا حسین و دلکش مرقع کہا جاسکتا ہے۔ غالب کی شوخی، ظرافت، شرافت، جدت و ندرت، نکتہ سنجی، منظر نگاری، بذلہ سنجی اور بے تکلفی کی جھلک ان خطوط میں صاف طور پر نظر آتی ہے۔ ان خطوط میں غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔

نصاب میں غالب کے دو خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں پہلا خط میاں داد خاں سیاح کے نام لکھا گیا ہے۔ اس خط میں غالب نے اپنی ضعیفی اور خرابی صحت کا ذکر کرتے ہوئے اشعار کی اصلاح سے معذرت چاہی ہے۔ گرمی کے سخت موسم اور ایک مصوّر کی لاپرواہی کا شکوہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے

عزیز شاگردنشی ہر گوپال تفتہ کا ذکر مشفقانہ انداز میں کیا ہے۔
دوسرا خط چودھری عبدالغفور سرور کے نام ہے جس میں غالب نے یہ ظاہر کیا ہے کہ خط کا سرنامہ
دیکھ کر انھیں فرحت و خوشی ملی۔ اور یہ افسوس بھی کیا کہ وہ کمزوری کے سبب خط لکھنے سے معذور ہو گئے ہیں۔
سرور کے چچا اور مولوی سید برکات حسین کا ذکر بھی خط میں آیا ہے۔
یہ دونوں خطوط مرزا غالب نے اپنے اندازِ خاص میں تحریر کیے ہیں جن کا ایک ایک لفظ انکساری،
خلوص اور محبت کی گواہی دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ دونوں خطوط محض رسمی نہ ہو کر اپنے محسنوں اور کرم فرماؤں کو
حالِ دل سنانے کا ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔

(۱)

بنام میاں دادخاں سیاح

منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان، سیف الحق منشی میاں دادخاں سیاح کو غالب ناتواں نیم جاں کی دعا پہنچے۔ بھائی میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب رعشہ وضعفِ بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب حال یہ ہے تو کہو صاحب، میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں؟ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سرکا بھیجا پگھلا جاتا ہے۔

دھوپ کو دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں میں لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھڑی ہے اندھیری اس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشہ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بدستور لے جا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔ تمہاری غزلیں میرا براہیم علی خاں بہادر کی غزلیں، میر عالم خان بہادر کی غزلیں، حکیم میر احمد حسین صاحب کی غزلیں اور کیا کہوں کس کس کی غزلیں۔ یہ سب ایک جگہ دھری ہیں۔ اگر کوئی دن زندگی اور ہے اور یہ گرمی خیر سے گذر گئی تو سب غزلوں کو دیکھوں گا۔

تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصوّر صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اتار کر لے گئے۔ اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینہ پر نقش اتروانا بھی ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں۔ عید کے دن وہ آئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی میری شبیہ کھینچ دو۔ وعدہ کیا تھا کہ کل نہیں تو پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم

یہ پانچواں مہینہ ہے۔ آج تک نہیں آئے۔

آغا غلام حسین خاں صاحب کا قطعہ پہنچا۔ اس میں کچھ تو شعر اصلاح طلب بھی تھے۔ اب اصلاح دے کون؟ میں تو اپنی مصیبت میں گرفتار۔ بارے ایک میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ بہ سواری ریل میرے دیکھنے کو آیا تھا۔ اس کو موقعہ محل بتا دیا، جو کہتا گیا۔ اسی طرح وہ بناتا گیا۔ وہ قطعہ کا کاغذ بعد اصلاح کے ”اکمل المطالع“ میں بھیج دیا۔ ہفتہ آئندہ میں تم بھی دیکھ لو گے۔

مرگِ ناگاہ کا طالب غالب

۱۱ جون ۱۸۶۷ء

(۲)

بنام چودھری عبدالغفور سرور

بندہ پرور،

بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامہ پر دستخط اور کے اور نام آپ کا پایا۔ دستخط دیکھ کر مفہوم ہوا، خط کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ تمہارے دشمن بعارضہ تپ و لرزہ رنجور ہیں۔ اللہ اللہ ضعف کی شدت کہ خط لکھنے سے معذور ہیں! خدا وہ دن دکھائے کہ تمہارا خط تمہارا دستخطی آئے۔ سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہو، خط پڑھ کر دہنی مسرت ہو۔ جب تک ایسا خط نہ آئے گا دل سودازدہ آرام نہ پائے گا۔ قاصد ڈاک کی راہ دیکھتا رہوں گا۔ جناب ایزدی میں سرگرم دعا رہوں گا۔ آپ کے عم عالی مقدر اور بزرگ آموزگار کو میرا سلام مع صنوف اشتیاق والوف احترام

جناب چودھری صاحب آؤ ہم تم حضرت عالم کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں ان کے کف پائے مبارک سے ملیں۔ میں سلام عرض کروں گا، تم معرف ہونا کہ غالب یہی ہے۔ اہل دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے۔ میں نے عزم قدم بوسی کیا۔ پیر و مرشد نے مجھے گلے لگایا۔ فرماتے ہیں کہ ”غالب تو اچھا ہے؟“ میں عرض کرتا ہوں کہ ”الحمد للہ، حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے؟ ارشاد ہوا کہ ”مولوی سید برکات حسین تیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔“ جناب یہ ان کی خوبیاں ہیں میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے۔ ضعف قوی و اضمحلال کہتے تاکہ میں ان کے کلام کی تصدیق کرتا۔ انکی غمخواری اور دردمند نوازی کا دم بھرتا۔

در کشا کش ضعغم نگسلدرواں از تن
این کہ من نے میرم ہم زنا تو اینہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیارنگ نکالا ”بوستانِ خیال“ کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں؟ حضرت سچ تو یوں ہے کہ تمہارے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے، سانس نہیں لے سکتا، اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی، پردل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچتا ہوں ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں، یوں ہی رویا کروں گا۔ دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دل نشین ہے، نتیجہ اس کا تسکین ہے ہیہات:

منحصر مرنے پہ ہو، جس کی امید نا امیدی اس کی، دیکھا چاہیے
اے حضرت شاہ عالم صاحب میرا سلام لیجیے۔ کاغذ باقی نہیں رہا۔ اپنے سب بھائیوں کو مع
میروزیر علی صاحب میرا سلام کہہ دیجیے گا۔

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
وہ نام جو کسی خاص خوبی یا تعریف کے سبب دیا جاتا ہے۔	لقب
وہ اعزازی نام جو سرکار یا حکومت کی جانب سے عطا ہو۔	خطاب
خاندان یا نسل کا تعلق	سلسلہ نسب
پیش لفظ، تمہید، کتاب کا مقدمہ	دیباچہ
الہم، تصویر	مرقع
عقل مند، ہوشیار، خوش بیان	نکتہ سنجی
خوش نصیبی، نیک بختی	سعادت
خوش نصیبی، صاحب نصیب	اقبال نشان
کم زور، مضحل	نا تو اں
کچکی، تھر تھر اہٹ	رعشہ
آنکھوں کی ناطقتی یا کم زوری، کم دکھائی دینا	ضعف بصارت
قاعدے کے مطابق، جوں کا توں، حسب معمول	بدستور
اندھیرا یا تاریک کونہ	گوشہ تاریک
نقاش، تصویر بنانے والا	مصوّر
شکل، صورت، تصویر	شبیہ

قطعہ	ٹکڑا، حصہ، نظم کی وہ قسم جس میں کوئی ایک چیز یا خیال بیان کیا جائے۔
اصلاح طلب	جس میں سدھار یا درستی کی ضرورت اور گنجائش ہو
مرگِ ناگاہ	اچانک یا یکایک آنے والی موت
طالب	مانگنے یا چاہنے والا، امیدوار
بندہ پرور	غلام کو پالنے والا، بندہ نواز
سرنامہ	خط کی پیشانی، خط لکھنے والے کا پتہ اور نشان
مفہوم	سمجھا گیا، جو سمجھ میں آئے
عارضہ	مرض، بیماری، دکھ، غم
تپ لرزہ	بخار کے سبب ہونے والی تھر تھراہٹ یا کپکپاہٹ
رنجور	دکھ، درد، بیماری
قاصد	پیغام لانے والا، نامہ بر، چٹھی رساں
ضعف	کمزوری، ناتوانی
شدت	سختی، تکلیف، زیادتی، کثرت
معذور	مجبور، ناچار، اپاہج
فرحت	خوشی، شادمانی، سرور
دوئی مسرت	دوہری خوشی، شادمانی، انبساط
دل سودازدہ	دیوانگی، پاگل پن میں مبتلا دل
جنابِ ایزدی	بارگاہِ الہی، اللہ کے حضور

سرگرم دعا	پُر جوش طریقے سے دعا کرنا یا دینا
عم	چچا، والد کا بھائی
عالی مقدار	جس کا شمار اعلیٰ اور بلند مرتبہ لوگوں میں ہو
بزرگ آموزگار	کسی فن میں مہارت یا دسترس رکھنے والا استاد
اشتیاق	شوق، آرزو، تمنا
الوف احترام	ہزار تو قیر و عزت کے ساتھ
کف پائے مبارک	پاؤں کے تلوے
معرف	تعریف کیا گیا، نشان کیا گیا
عزم قدم بوسی	قدم چومنے کی نیت یا ارادہ، کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش
ضعف قوی	دماغی کمزوری
اضمحلال	افسردگی، کاہلی، سستی
تصدیق	صداقت، سچ کی تائید، ثبوت
دانہ ڈالنا (مجاورہ)	کسی کو پھنسانے کی کوشش کرنا
صغریٰ	چھوٹی لڑکی، سب سے چھوٹی چیز
کبریٰ	بہت بڑی، بہت بزرگ، اکبر کا مؤنث
دل نشین	دل میں بیٹھنے والا، دل پر اثر کرنے والا
تسکین	آرام، تسلی، اطمینان
ہیہات	افسوس، ہائے ہائے

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ غالب کے پاس کس کا قطعہ پہنچا تھا؟
- ۲۔ غالب تمام دن کہاں پڑے رہتے تھے؟
- ۳۔ لفظ ”گبری“ کا مذکر لکھیے۔

مختصر سوالات:

- ۴۔ لفظ ”احترام“ کے مترادف الفاظ لکھیے۔
- ۵۔ ’دانہ ڈالنا‘ محاورے کا مطلب لکھتے ہوئے اُسے اپنے جملے میں استعمال کیجیے۔
- ۶۔ غالب نے کن کن شعرا کی غزلیں ایک جگہ دھری تھیں؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ غالب کی سوانح حیات لکھتے ہوئے ان کی مکتوب نگاری کی خوبیاں بیان کیجیے۔
- ۸۔ غالب کے خط ’بنام میاں دادخاں سیاح‘ کا خلاصہ لکھیے۔

ڈاکٹر شاہد الحق چشتی

مضمون نگاری وانشا پر دازی: ایک تعارف

اردو میں صنفِ مضمون نگاری وانشا پر دازی بھی جدید اصنافِ ادب مثلاً ناول، ڈراما، افسانہ، مختصر افسانہ وغیرہ کی طرح ہی مغربی ادب سے آئی اور ایک صنفِ ادب کی حیثیت سے رائج ہوئی۔ اردو کے کچھ ادیبوں کے نزدیک مضمون نگاری اور انشا پر دازی علاحدہ علاحدہ صنف ہیں۔ جب کہ بعض ادیبوں کے مطابق دونوں ایک ہی زمرے میں آتے ہیں۔

مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری یا انشا پر دازی کو سمجھنے کے لیے دونوں کی تعریف سمجھنا ضروری

ہے۔

کسی عنوان پر اپنے خیالات کو ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر دینے کو مضمون کہتے ہیں۔ مضمون کو انگریزی میں Essay کہا جاتا ہے۔

لفظ Essay کے لیے اردو میں سب سے پہلے لفظ مضمون کا استعمال سر سید احمد خاں نے کیا۔ صنفِ مضمون کی جامع تعریف 'انسائیکلو پیڈیا آف بری ٹینیکا' میں وضاحت و صراحت کے ساتھ کی گئی ہے۔ جس کا ترجمہ مشہور نقاد نظیر صدیقی نے اس طرح کیا ہے۔

”ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے ایسے اوسط لمبائی کا ایک ایسا

مضمون ہے جو عموماً نثر میں ہوتا ہے اور جس میں سہل اور سرسری

انداز میں کسی موضوع سے اور سچ پوچھیے تو صرف اُس موضوع سے

بحث کی جاتی ہے جو لکھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔“

مشہور انگریزی نقاد جانسن نے انشائیہ (Essay) کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

”انشائیہ ذہن کی ایک ترنگ ہے۔“

یعنی انسان کے ذہن میں کسی خاص موضوع پر جو خیال آتے ہیں، انھیں ترتیب کے ساتھ تحریر کر

دینے کو انشائیہ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسنین انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

”انشائیہ نثر کی غزل ہے جو واردات قلب سے زیادہ محشر خیال کی

ترجمانی کرتی ہے۔“

انشائیہ کے متعلق مشہور ادیب ڈاکٹر وزیر آغا فرماتے ہیں:-

”انشائیہ کا خالق اُس شخص کی طرح ہے جو دفتر کی چھٹی کے بعد

اپنے گھر پہنچتا ہے، چست اور تنگ کپڑے اتار کر ڈھیلے ڈھالے

کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ مونڈھے پر نیم دراز ہو کر

حقے کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے

احباب سے محو گفتگو ہو جاتا ہے۔“

انشائیہ کے متعلق مذکورہ خیالات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انشائیہ نگاری یا انشا پردازی وہ

تحریر ہے جس میں خیالات کو مربوط انداز میں تحریر کرنا لازمی نہیں۔ یہ ایک ذہنی ایچ ہے۔ انسان کے ذہن

میں جو خیالات بے ترتیب پیدا ہوتے ہیں انھیں وہ ایک ترتیب سے اپنے مذاق اور مزاج کی چاشنی میں

ڈبو کر تحریر کرتا ہے۔ یعنی انشائیہ میں انشائیہ نگار کی خوش طبعی اور شگفتہ بیانی کے ساتھ ہی بے تکلفی اور سادگی

کی جھلک بھی ملتی ہے۔ انشائیہ میں اختصار ہوتا ہے اور موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی اس میں بے ربط خیال

کے ساتھ ہی تحریر کی آزادی بھی ہوتی ہے۔ لہذا تخلیق نگار کی تخلیقی صلاحیتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ انشائیہ میں

مسرت و انبساط کی کارفرمائی اور داخلی خیالات کی شمولیت کی وجہ سے اس کے مطالعے سے دنیا کی فکروں

سے نجات ملتی ہے۔

اردو میں مضمون نگاری اور انشا پردازی کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ سب سے پہلے سرسید نے مضمون نگاری اور مولانا محمد حسین آزاد نے انشا پردازی کو فروغ دیا۔ سرسید جو اپنی قوم و ملک کے بہت بڑے ہمدرد اور راہنما تھے انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر قوم و ملت کی ابتری، بد حالی اور جہالت و پس ماندگی دور کرنے کی غرض سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ جن میں مذہبی، اخلاقی، سیاسی، تاریخی، فکری، معاشرتی اور علمی و ادبی موضوعات پر زیادہ توجہ دی گئی۔ رسالہ ”تہذیب الاخلاق“ میں اس قسم کے مضامین شامل کیے گئے۔ اسی طرح مولانا حالی نے مقالاتِ حالی میں اور مولانا شبلی نے مقالاتِ شبلی میں علمی، ادبی، تحقیقی اور مذہبی موضوعات پر علاحدہ سے مضامین لکھے۔ اسی طرح انشائیہ نگاری کی مثالیں ہمیں مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف ’نیرنگ خیال‘ اور اس کے بعد رسالہ ’مخزن‘ میں ملتی ہیں۔ جس کے ایڈیٹر سر عبدالقادر تھے۔

اردو میں مضمون نگاری اور انشا پردازی کی لمبی روایت میں سرسید اور مولانا محمد حسین آزاد کے علاوہ مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، عبدالحلیم شرر، مولانا وحید الدین سلیم، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، قاضی عبدالغفار، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی، مولانا ابوالکلام آزاد، محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، محی الدین قادری زور، پروفیسر احتشام حسین، کلیم الدین احمد، پروفیسر خورشید الاسلام، احمد جمال پاشا، کنہیا لال کپور، نظیر صدیقی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

بیسویں صدی میں اردو کے مایہ ناز ادیب، مفکر اور عظیم مجاہد آزادی مولانا ابوالکلام آزاد ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ آزاد کا پورا نام محی الدین احمد تھا۔ قلمی نام (تخلص) آزاد اور تاریخی نام فیروز بخت تھا۔ لیکن ابوالکلام آزاد کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خیر الدین تھا، جو بہت بڑے عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ بنگال کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب (غدر) کے بعد مولانا خیر الدین بنگال سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں ان کی شادی مدینہ منورہ کے ایک جید عالم دین شیخ محمد ظہر کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جب مولانا آزاد تقریباً دو برس کے تھے تو ان کے والد ۱۸۹۰ء میں کلکتہ لوٹ آئے اور یہیں مستقل قیام کیا۔ آزاد کی ابتدائی تعلیم کلکتہ میں ہی ہوئی۔ آزاد نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور بنگالی زبان کے ساتھ ہی ہندی زبان میں بھی مہارت حاصل کی۔ علاوہ ازیں انھیں علم فقہ میں بھی دسترس حاصل تھی۔ علم الحساب، فلسفہ، سائنس اور تاریخ عالم کا علم بھی انہوں نے اپنے وقت کے جید علما سے حاصل کیا۔ تیرہ برس کی عمر میں آزاد کی شادی زینت بیگم سے ہوئی۔ آزاد نے بچپن میں ہی صحافت کے میدان میں قدم رکھ لیا تھا۔ ۱۹۰۰ء میں محض ۱۲ برس کی عمر میں انہوں نے ہفتہ وار رسالہ 'المصباح' جاری کیا۔ جب وہ ۱۴ برس کے ہوئے تو انھوں نے مشہور رسالہ 'مخزن' میں مضامین لکھنا شروع کیے۔ اور اپنے ہم عمر طلبا کو پڑھانے بھی لگے۔ وہ اپنے دور کے طلبا سے بہت آگے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں انہوں نے کلکتہ سے رسالہ 'لسان الصدق' جاری کیا۔ جو بعد میں بہت مشہور ہوا۔ تقریباً ۱۶ برس کی عمر میں انھوں نے ایک منظوم رسالہ 'نیرنگ عالم' شائع کیا۔

اردو ادب میں مولانا آزاد کا عظیم کارنامہ ہفتہ وار اخبار 'الہلال' تھا جو انھوں نے ۱۹۱۲ء میں جاری کیا۔ اس اخبار میں انہوں نے انگریزی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف اور ہندو مسلم اتحاد پر مضامین لکھے۔ اور نوجوان مسلمانوں میں آزادی کے جذبات بیدار کیے۔ لہذا برطانوی حکومت نے ۱۹۱۴ء میں اس اخبار پر پابندی لگا دی۔ مولانا نے اپنے اس مشن کو جاری رکھنے کے لیے اخبار 'البلاغ' جاری کیا۔ اس اخبار کا مقصد بھی مسلم نوجوانوں میں قومیت کا جذبہ بیدار کرنا اور ہندو مسلم اتحاد کو مضبوطی دینا تھا۔

پہلی جنگ عظیم (عالمی جنگ ۱۸-۱۹۱۴ء) کے دوران ہی خلافت تحریک شروع ہوئی۔ جس کا مقصد عالمی سطح پر انگریزوں کی مخالفت کرنا تھا جس کی راہنمائی ترکی کی عظیم عثمانی سلطنت کر رہی تھی۔ (جو اس پہلی عالمی جنگ میں بھی انگریزوں کے خلاف اتحادیوں کے ساتھ شامل تھی۔) دنیا کے تمام مسلمان انھیں اپنا خلیفہ تسلیم کرتے تھے۔ مولانا نے مناسب موقع دیکھ کر خلافت تحریک کی حمایت کی اور ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزی حکومت کے خلاف اُکسا کر ان میں سیاسی بیداری پیدا کی اور معاشرتی اصلاح کی جانب راغب کیا۔ اس سے ہندوستان میں مولانا کی مقبولیت بے حد بڑھ گئی۔ لہذا انگریزی حکومت نے 'البلاغ' کو غیر قانونی قرار دے کر مولانا کو گرفتار کر لیا اور رانچی جیل میں ڈال دیا۔ جہاں وہ یکم جنوری ۱۹۲۰ء تک قید رہے۔

مولانا چونکہ بچپن سے ہی سیاست اور صحافت میں دلچسپی رکھتے تھے لہذا ان دنوں ہندوستان کی تحریک آزادی میں مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تشدد سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے ساتھ تحریک آزادی میں شامل ہو گئے۔ وہ دو مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ دوسرے دور کے عہد صدارت (۱۹۲۰-۲۵ء) میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف 'بھارت چھوڑو تحریک (Quit India Movement - 1942)' شروع ہوئی۔ ملک کی آزادی کے بعد وہ

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم بھی بنائے گئے۔ انھوں نے وزیر تعلیم رہتے ہوئے ہندوستان کی تعلیمی پالیسی مرتب کی۔ ان کے عہد وزارت میں ہی ہندوستان میں آئی آئی ٹی (IIT)، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) جیسے اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ مولانا کی عظیم سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی اصلاحات اور خدمات کی بنا پر حکومت ہند نے ۱۹۹۲ء میں انھیں ہندوستان کے سب سے بڑے شہری اعزاز 'بھارت رتن' سے نوازا۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو ۶۹ برس کی عمر میں قوم ملک کا یہ عظیم راہبر اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔ ان کی یاد میں ان کے یوم ولادت ۱۱ نومبر کو ہر سال ملک بھر میں "قومی تعلیمی دن" (National Education Day) کے طور پر منایا جاتا ہے۔

مولانا آزاد نہ صرف ایک اعلیٰ قدر سیاست داں تھے بلکہ وہ ایک عظیم مصلح قوم، ماہر تعلیم، شاعر، مفکر، عمدہ خطیب، اعلیٰ درجے کے صحافی اور اردو کے عظیم نثر نگار بھی تھے۔ ان کی ادبی و فکری عظمت ان کے اخبارات 'الہلال' اور 'البلاغ' سے ثابت ہوتی ہے علاوہ ازیں ان کے خطوط کا مجموعہ 'غبار خاطر' (جو انھوں نے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء کے درمیان قلعہ احمد نگر جیل سے اپنے دوست مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو لکھے تھے، لیکن اپنے پاس ہی رکھے) بھی اردو ادب میں ان کی عظمت کا امین ہے۔ انھیں زبان پر عبور حاصل تھا۔ وہ اپنے خیالات کو آسان اور با محاورہ زبان میں پُر اثر طریقے سے ظاہر کرتے تھے۔ ان کا انداز خطیبانہ ہوتا تھا۔ ان کی تحریر و تقریر میں بلندی فکر، دردمندی، عظمتِ نفس، علمیت، متانت و سنجیدگی اور حُسن و رنگینی کے احساسات کے ساتھ ہی طنز و ظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ جو پڑھنے اور سننے والے کے دل و دماغ پر اثر کرتے ہوئے اُس کی روح کو بیدار کرتی ہے۔ اور اُسے حرکت و عمل پر مجبور کرتی ہے۔ سطحی اشتعال انگیزی اور لفظی بازی گری کے بجائے آزاد اپنی تحریر و تقریر سے قوم کے فکر و شعور کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آزاد کی ایک اور ادبی تخلیق ان کی خودنوشت سوانح "تذکرہ" ہے۔

شامل نصاب مضمون ”حقیقی عظمت“ ان کی اسی خودنوشت ”تذکرہ“ سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے اسلاف کے کردار و اعمال کا ذکر کرتے ہوئے فخر محسوس کیا ہے۔ اس مضمون میں آزاد نے اسلام اور مسلمانوں کی شاندار پارینہ روایات اور کارناموں پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ اور بتایا ہے کہ انسان کے خود کردہ (ذاتی اعمال) سے ہی اس کو عزت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔

حقیقی عظمت

انسان کے لیے معیار شرف جو ہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایات پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں نہ یہ کہ اپنی عزت کے لیے خاندان کے شرف رفتہ کے محتاج ہوں۔ ارباب ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور عظمت و رفعت کی تعریف صرف اسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا تھا۔ نیپولین کا ایک قول مجھے نہیں بھولتا۔ فتح پروشیا کے بعد جب فریڈرک اعظم کی قبر پر گیا تو دیکھا کہ فریڈرک کی تلوار قبر پر لٹک رہی ہے۔ نیپولین نے تلوار اٹھا کر ایک ساتھی کے حوالے کی اور کہا کہ پیرس کے عجائب خانہ کی نذر کر دوں گا، یہ سن کر جنرل نے کہا ”اگر مجھ کو ایسی باعظمت اور تاریخی تلوار ملتی تو کبھی کسی دوسرے کو نہ دیتا۔“ نیپولین نے کہا ”کیا میرے پاس تلوار نہیں؟“

پس سچی عظمت کی راہ یہ نہیں ہے کہ فریڈرک کی عظمت یافتہ تلوار لوگوں کو دکھلائیں۔ سچی عظمت وہ ہے جو خود ہماری تلوار کو ہماری نسبت سے ملی ہو اور اگر ایسا ہو گیا ہے تو یہ بس کرتا ہے۔ ہم کو اپنی نیام میں صرف اپنی ہی جو ہر دار تلوار رکھنی چاہیے۔ دوسروں کی تلوار کی نمائش سے اگر دیکھنے والوں کا تعجب و احترام حاصل بھی کر لیا گیا تو اس کے اصلی مالک ہم نہیں ہیں، تلوار کا مالک ہے!

خاندان کے فخر کا بُت بھی دنیا کے عہد جاہلیہ کی ایک یادگار ہے، اور اسلام نے انسان کے بہت سے بنائے ہوئے بُتوں کے ساتھ اس کو بھی توڑ دیا تھا۔ ہم آج بھی دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ ”عمل“ کا فرشتہ کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا کرتا ہے اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے۔

بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ کی نسبت اس سے زیادہ ہم کیا جانتے ہیں کہ مسلمان تھے۔ اور سلمان فارسیؓ سے جب اس کے خاندان کا حال پوچھا گیا تو اس نے کہا ”سلمان بن اسلام“ اور جب فاروق اعظمؓ کے جنازہ پر نماز کی صفیں کھڑی ہوئیں تو ہزاروں قریشی اور ہاشمی مقتدی تھے اور صہیب رومیؓ امام۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرتی ترقی اور قدرتی حقوق کے قیام کے لیے نسب و خاندان کے امتیازِ باطل سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ یہی چیز ہے جو انسان کو اس کی ذاتی قوتوں کے استعمال اور ان کے ثمرات سے محروم رکھنا چاہتی ہے اور اس خلاف فطرت راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ ایک شخص کو باوجود عدم استحقاق ذاتی مستحق شرف سمجھا جائے اور دوسرے کو باوجود استحقاق ذاتی محروم کر دیا جائے۔ اسلام نے اِنْ اَكْرَمُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اتَّقَاكُمْ اور لَيْسَ لِّلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کے قانونِ عام کا اعلان کر کے اسی مہلک روگ کو مٹانا چاہا۔ اور قرآن نے بتلایا کہ دنیا کی تمام قدیم صدائیں بھی اسی قانون کی طرف دعوت دیتی رہی ہیں۔ صحفِ ابراہیمؑ و موسیٰؑ میں بھی یہی تھا۔ لیکن افسوس کہ غرورِ نسل و وطن کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پھر جوڑ لیے گئے اور نئے نئے بھیسوں میں پھر اس کی پرستش شروع ہو گئی۔

اب بہت کم سر ملیں گے جو نشہِ باطل سے سرگراں نہ ہوں۔ الا ماشاء اللہ پس الحمد للہ کہ اس کی طلب ہے اور نہ اس پر اعتماد اور نہ نا اہلوں کے اس فریبِ عزت اور سراپِ شرف کی ضرورت۔ طلب جس گوہر مقصود کی ہے وہ توفیقِ عمل ہے اور اگر کچھ اعتماد ہے تو اپنی عجز و شکستگی اور اس کی نظرِ کرم کی عاجز نوازیوں پر۔

البتہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے جن کے ذریعہ وہ اس دنیا میں اپنے بندوں کو سعادت بخشتا ہے ایک بڑی نعمت آباءِ صالحین کے لیے یہ ہے کہ اولادِ صالح عطا فرمائے اور اولاد کے لیے یہ ہے کہ والدین صالح ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی خاندان میں عرصے تک علم و صلاح کا باقی و جاری رہنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ان دونوں نعمتوں سے فیض یاب ہو، آباء کو اولادِ صالح اور اولاد کو آباءِ صالح نصیب ہوں۔ پس بلاشبہ اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم یقین کرتا ہوں کہ مجھ کو ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس میں

صدیوں سے سلسلہ علم و ارشاد قائم و جاری ہے، اور جس کے اسلاف کرام کے اعمالِ صالحہ کا پاک ورثہ یکے بعد دیگرے اخلاف تک منتقل ہوتا آیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کے اخلاف کو حق گوئی و حق پرستی اور طریق استقامت و عشقِ حق میں سرفروشی و جاں سپاری اور مغرورانِ تاج و تخت و بندگانِ مال و جاہ کے مقابلے میں بے نیازی و سرگرانی ہمیشہ اپنے اسلاف کے ورثہ میں ملی ہے۔ اسی کو اپنا موروثی خزانہ اور اسی کو اپنا خاندانی تاج و تخت سمجھتا ہوں۔

اگر یہی غرورِ نسب و خاندان ہے تو اس کے اعتراف میں مجھے کچھ باک نہیں۔ بلاشبہ اسلاف کے ورثہ علم اور حق پرستی کو دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں، اور نہیں چاہتا کہ کبھی اس نشہ سے میرا دماغ خالی ہو۔

بڑی سے بڑی آرزو جس کو اپنے دل میں رکھ سکتا ہوں یہی ہے کہ زندگی کی آخری گھڑیوں تک اپنے اسلاف کرام کے طریقِ حق پر مستقیم رہنے کی توفیق پاؤں اور اپنی ساری زندگی اسی راہ کی کوچہ گردی میں بسر کر دوں جس کا نشانِ سفر وہ اپنی یادگار میں چھوڑ گئے ہیں۔ خدمتِ علم و حق کا ایک سرمایہ سعادت ہے جو مجھ تہی دست تک پہنچتا ہے۔ میری محرومی ہے اگر اس کو بچانہ سکا اور فضلِ الہی کی بخشش ہے اگر اس کی عزت اور نام نیک کو آنے والوں کے لیے محفوظ چھوڑ گیا۔

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
بزرگی کا پیمانہ	معیارِ شرف
اصلی یا حقیقی ہنر	جوہرِ ذاتی
بزرگ، پہلے وقتوں کے لوگ	اسلاف
پرانی روایتیں	روایاتِ پارینہ
ناحق - غلط بے اصل - جھوٹا	باطل
اصل قابلیت، اصل حق	استحقاقِ ذاتی
وہ چھوٹی کتابیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ پر نازل فرمائیں	صحفِ ابراہیمؑ و موسیٰؑ
ناراض، نشے کا خماری	سرگران
پرہیزگار، نیک	صالح
خلف کی جمع، اولاد، آنے والی نسل	اخلاف
پشتینی، باپ دادا کا	موروثی
اقرار کرنا، مان لینا	اعتراف
مفلس، غریب، خالی ہاتھ	تہی دست

مشقی سوالات

مختصر سوالات:

- ۱۔ مضمون 'حقیقی عظمت' کے مصنف کا نام بتائیے۔
- ۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
- ۳۔ فریڈرک اعظم کی قبر پر نیپولین کو کیا چیز ملی؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ فریڈرک اعظم کی تلوار کے متعلق نیپولین اور جنرل کے درمیان کیا گفتگو ہوئی؟
- ۵۔ مولانا آزاد کے مطابق سچی عظمت کیا ہے؟
- ۶۔ حضرت بلال حبشیؓ اور حضرت صہیب رومیؓ کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات زندگی تحریر کیجیے اور ان کی نثر نگاری کی خوبیوں پر روشنی ڈالیے۔
- ۸۔ مولانا آزاد کے مضمون 'حقیقی عظمت' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

مولانا وحید الدین سلیم

مولانا وحید الدین سلیم ۱۸۶۷ء میں قصبہ پانی پت ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی سید فرید الدین پانی پت کے مشہور سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندر کے آستانے کے متولی تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ حفظ قرآن گھر پر ہی استانی شمس النساء آپا نے کرایا۔ والد حاجی فرید الدین کے انتقال کے بعد سلیم کی تعلیم و تربیت ان کے والد کے کرم فرما اور بزرگ مولانا سید غوث علی شاہ کی زیر نگرانی ہوئی۔ مولانا کو بچپن سے ہی فارسی کا شوق تھا۔ نہایت ذہین تھے۔ محض ۱۴ برس کی عمر میں مولانا نے مولانا سید غوث علی شاہ کی مدح میں فارسی میں ایک قصیدہ لکھا جو ایک سواک اشعار پر مشتمل تھا اور اسے مولانا اور دیگر عوام کے سامنے پڑھا۔ جسے سن کر عوام اور خود مولانا مجو حیرت ہو گئے۔

پانی پت میں ڈل درجہ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا لاہور تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے عربی ادب کی تعلیم مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے حاصل کی، تفسیر بھی انھیں سے پڑھی۔ فقہ، حدیث، منطق اور فلسفہ کی تعلیم مولانا عبدالاحد ٹونکی سے حاصل کی۔ تلاشِ معاش کے لیے ریاست بہاولپور (پاکستان) گئے جہاں محکمہ تعلیم، ریاست بہاولپور میں ملازمت کی۔ کچھ عرصہ بعد رامپور کے ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ لیکن مرضِ تشنج (انٹھن کی بیماری) کی وجہ سے تقریباً چھ سال تک مسلسل بستر پر ہی رہے۔ صحت یابی کے بعد مولانا نے جالندھر کے ایک مشہور حکیم سے طبِ یونانی کافن حاصل کیا اور پانی پت میں مطب (دواخانہ) شروع کیا۔

سر سید نے مولانا کی قابلیت اور جوہر کو پہچانا اور انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ مولانا ایک عرصہ تک سر سید کے لٹریٹری سکریٹری رہے۔ مولانا سر سید کے ’علی گڑھ گزٹ‘ اور ’تہذیب الاخلاق‘ رسالوں کے لیے بھی مواد فراہم کرتے تھے۔ سر سید کے انتقال کے بعد مولانا نے رسالہ ’معارف‘ نکالا اور پھر کئی برس تک ’علی گڑھ گزٹ‘ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ سے نکلنے والے ’مسلم گزٹ‘ کے بھی ایڈیٹر بنے۔

سلیم عمر کے آخری دور میں محکمہ دارالترجمہ سے وابستہ ہو گئے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے تیار ہونے والی کتب کے تراجم کا کام سنبھالا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کھلنے پر مولانا شعبہ اردو میں اسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ محض چار سال میں ہی اپنی لیاقت اور صلاحیت کی وجہ سے انھیں پروفیسر بنا دیا گیا۔ اور آخری عمر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد میں آپ کا انتقال ہوا۔

مولانا اردو، عربی اور فارسی کے جید عالم اور فارسی و اردو کے اچھے شاعر بھی تھے۔ وہ مغربی علوم سے بھی بخوبی واقف تھے۔ مولانا حالی کی ان پر خاص نگاہ تھی۔ مولانا نے بچپن سے ہی شاعری شروع کر دی تھی اور ابتدا میں روایتی انداز میں غزلیں کہتے تھے۔ لیکن لاہور میں رہتے ہوئے ان پر حالی کا اثر پڑا اور انھوں نے قومی نظمیں لکھیں۔

سلیم نے نظم نگاری کے ساتھ ہی درس و تدریس اور نثر پر زیادہ توجہ دی۔ ان کی نثر نہایت سادہ سلیس اور معنی خیز خیالات پر مبنی ہوتی تھی۔ وہ عربی اور فارسی کے دقیق الفاظ سے اجتناب کرتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور ہمیشہ غیر مذہب کے بزرگوں اور ان کی تاریخ و ادب کی عظمت و احترام کرتے تھے۔ سر سید کی صحبت کی وجہ سے بھی ان کی نثر نگاری پر اثر پڑا۔ اپنے خیالات نہایت واضح اور آسان زبان میں ظاہر کرتے تھے۔ اپنی تحریر و تقریر میں ہندی کے میٹھے اور سریلے الفاظ نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے۔ ان کی نگاہ وسیع اور علم ٹھوس تھا۔ ان کے یادگار مضامین میں ’تلسی داس کی

شاعری“ اور ”عربوں کی شاعری“ بہت مشہور ہیں۔ ان کی مشہور کتاب ”وضع اصطلاحات“ ان کے اعلیٰ تحقیقی مرتبہ علمی کمال کا ثبوت ہے۔ زیر نظر مضمون ’خطاب بہ طلباء‘ میں سلیم نے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے انھیں دنیا اور اس کی حقیقت اور یہاں درپیش دشواریوں اور ان کا سامنا کر کے منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے کوشش و عمل کرنے کی ترغیب دی ہے۔

وحید الدین سلیم

خطاب بہ طلباء

عزیز نوجوانو!

کتابوں کی دنیا ایک خیالی دنیا ہے۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو اس دنیا سے نکل کر اصلی دنیا میں قدم رکھنا چاہیے۔ جب وہ اصلی دنیا میں جو خیالی دنیا نہیں ہے بلکہ ایک زندہ دنیا ہے قدم رکھیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ ان کے چاروں طرف خطرات ہیں، مشکلات ہیں۔ وہ ان خطرات و مشکلات کی صفوں کو چیر کر آگے بڑھیں تو ان کے لیے اس زندہ دنیا میں کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ اگر ان کو زندہ رہنا ہے اگر ان کو کارآمد اور مفید شہری بننا ہے تو وہ پھر کمر باندھ لیں کہ اپنے گرد و پیش کے خطرات و مشکلات کے پہاڑوں کو کاٹ ڈالیں گے اور ان کے درمیان چلنے کو ایک کشادہ رستہ بنائیں گے۔ ورنہ پھر ان کو انہیں کتابوں کے قبرستان میں جن کو وہ پڑھتے رہے ہیں دفن ہو جانا چاہیے اور ترقی اور کامیابی کا کبھی نام نہ لینا چاہیے۔

کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس روشن خیال ایڈیٹر کی تقریر پر غور کرنا چاہیے۔ کتابوں کو پڑھ کر گزشتہ نامور انسانوں کی نسبت ہم خیال کرتے ہیں کہ ان کو خدا نے غیر معمولی قوتیں عطا کی تھیں یا ان کے زمانے کے لوگ ایسے شائستہ اور شریف تھے جن سے اپنی کامیابی اور ترقی کے رستے میں کسی خلل کا اندیشہ ان کو پیدا نہ ہوا۔ حاشا وکلا! جس طرح ہمارا زمانہ خطرات و مشکلات سے لبریز ہے، جس طرح مخالف طاقتیں ہمیں اب ہر طرف دباؤ ڈالتی نظر آتی تھیں، جس طرح قدم قدم پر زحمتوں اور رکاوٹوں کا سامنا ہمیں اب کرنا پڑتا ہے، جس طرح تعصب و حسد کے دیو ہمارے سامنے سیدھے تانے اب کھڑے ہیں، یہی حال پہلے بھی تھا مگر جن لوگوں نے ترقی اور کامیابی حاصل کی اور شہرت اور ناموری کی بلندی پر پہنچے انھوں نے لاجب ارادے اور اٹل ہمت سے کام لیا۔ وہ مصیبتوں کی صفوں کو چیر کر آگے بڑھے۔ ان

کے عزمِ راسخ کے سامنے پہاڑ پانی ہو کر بہہ گئے۔ مشکلات کی سنگین چٹانیں پاش پاش ہو گئیں۔ ان کو بار بار ناکامیاں ہوئیں مگر مایوسی ان کے تیور پر شکن نہ ڈال سکی۔ انھوں نے بہت دفعہ شکست کھائی مگر وہ ہر دفعہ پسپا ہو کر آگے بڑھے اور آخر کار اس منزل پر پہنچ گئے جہاں ان کو پہنچنا مطلوب تھا۔ دنیا میں جس طرح خود غرض، حاسد متعصب اور عیّا آج موجود ہیں، پہلے بھی تھے۔ ایسے ہی لوگوں کے درمیان وہ ناموران بھی گھرے ہوئے تھے مگر جس دُھن میں وہ مجھتے تھے اس سے کوئی چیز ان کو نہ ہٹا سکی۔ جس نشہ میں وہ مست تھے اس کو کوئی ترشی نہ اتا سکی۔

ہمارے کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو تعلیم ختم کرنے کے بعد اصلی اور زندہ دنیا میں داخل ہونا ہے۔ اگر وہ اس کے لیے تیاری نہ کریں تو پھر ان کا ناکام ہونا اور شکست پانا ضروری ہے۔ اس دنیا میں کامیاب ہونے کے لیے جن اصولوں کی ضرورت ہے وہ کالجوں کے احاطے میں بتائے نہیں جاتے۔ موجودہ طرزِ تعلیم سے وہ اخلاقی تربیت نہیں ہو سکتی جو ان کو اصلی اور زندہ دنیا میں کامیاب کرے۔ یہ تربیت ہوشیاری کے ساتھ خود اصلی اور زندہ دنیا ہی میں داخل ہونے سے مل سکتی ہے۔ دانایانِ فرنگ نے ایسی انجمنیں قائم کی ہیں جن کے ارکان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو فیس لے کر گھر بیٹھے ایسے اصولوں کی تعلیم دیتے اور اصولوں کی مشق کراتے ہیں جن کے سبب وہ کامیاب ہوں۔ مگر وہ تعلیم بے کار ہے۔ اگر سبق لینے والے طلبہ سوسائٹی میں ان اصولوں کی مشق عملی نہ کریں، یہ اصول کوئی انوکھے اور نرالے اصول نہیں۔ دنیا میں جن لوگوں نے کامیابی اور ترقی حاصل کی ہے ان کو پیش آنے والے خطرات اور مشکلات نے یہی اصول بتائے تھے۔ اگر وہ زحمتوں اور مصیبتوں میں پڑ کر ان اصولوں کی عملی مشق نہ کرتے تو منزلِ مقصود تک کبھی پہنچ نہیں سکتے تھے۔ غور کرنے والوں نے کامیاب اور ترقی یافتہ انسانوں کی زندگیاں پیش نظر رکھ کر چند اصول مرتب کر لیے ہیں اور ان کو وہ تمام دنیا میں عام کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر نوجوان جو زندہ دنیا میں قدم رکھتا ہے اور کوئی سطحِ نظر اس کے سامنے ہے ان اصولوں کی مشق و مزاوالت

کرے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ میرے نزدیک ہر سوچنے والا دماغ ان اصولوں تک ضرور پہنچے گا اور ہر غور کرنے والا دل ان کی صداقت کو محسوس کرے گا۔ یہ ہر انسان کے دل کے اندر پوشیدہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ سمجھ کر فراموش نہ کیے جائیں، ضرورت ہے کہ ان پر یقین کیا جائے۔ ضرورت ہے کہ ان پر عمل کیا جائے۔

جو پیغام میں تعلیم یافتہ نوجوانوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس میں انھیں فطری اور ابدی اصولوں کی روح ہے جو ایشیا کے ہر مفکر کے قلب میں اسی طرح موجزن ہیں جس طرح یورپ کا ایک ہوش مند اور مفکر انسان اس کو محسوس کرتا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہر نوجوان کو اپنے دل میں کوئی عمدہ خواہش پیدا کرنی چاہیے۔ خواہش کا ماخذ کوئی ایسا فائدہ ہے جو ہونا چاہیے مگر ہے نہیں۔ یعنی فائدہ غیر موجود کے احساس کا نام خواہش ہے، مسرت و انبساط کی تلاش کا نام خواہش ہے۔ یہ ایک محرک ہے جو ہمیں فعل یا ترک فعل پر مجبور کرتا ہے۔ یہ محرک ہماری تمام قوتوں کو اکساتا ہے اور ہم میں کام کرنے کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ جو جذبات اس عمدہ خواہش کی تکمیل میں موجزن ہو ان کو مرنے دینا نہیں چاہیے، اپنے تمام دل و دماغ کو اس میں منہمک کر دینا چاہیے۔ اپنی خواہش کو اس قدر بار بار سوچنا اور دل میں لانا چاہیے کہ کوئی چیز اس کے سوا کا شانہ دل میں نہ رہے۔ ایک بڑے نامور انسان کا قول ہے کہ جیسا سوچو گے ویسا کرو گے اور جیسا کرو گے ویسا بنو گے اور جیسا بنو گے ویسے نتیجے حاصل کرو گے۔ ایک عالی خیال انسان کی نصیحت ہے کہ ”اپنی خواہشوں اور ان کے جذبات کو پڑ مردہ نہ ہونے دو ان کا احترام کرو، ان کو پیش گوئیاں سمجھو جو پوری ہونے کے لیے تیار ہیں۔“

خواہش ایک زبردست محرک ہے جو ارادے میں تموج پیدا کرتا ہے۔ پُر جوش خواہش اور مضمم ارادہ وہ اوصاف ہیں جو ناممکن کو ممکن کر دکھاتے ہیں۔ جوش کیا ہے؟ ایک متعدد بخار ہے جو اپنی گرم اور

بے قرار لہروں کا جال اپنے گرد و پیش پھیلا دیتا ہے اور خود بیچ میں بیٹھ جاتا ہے اس لیے کہ تمنا کو مسخر کرے اور مراد کو شکار کرے۔ جب الہام ربّانی ہماری ذاتی دلچسپیوں اور ہمارے فطری رجحانوں کو اپنے سایہ عاطفت میں لیتا ہے، اسی حالت کا نام جوش ہے۔ یہ قوت ہر کس و ناکس کے اندر ودیعت کی گئی ہے مگر بہت کم ہیں جو اس کے اظہار کی خواہش کرتے ہیں۔ جوش ایک قسم کی بھاپ ہے جو ہماری دماغی مشین کو چلاتی اور ہمیں کامیابی اور کامرانی کی منزل تک پہنچاتی ہے۔ مجنونانہ جوش شخصیت کی جان اور کامیابی کی روح رواں ہے۔ پر جوش خواہش کے ساتھ مصمم ارادے کی ضرورت ہے۔ ارادہ کارخانہ دنیا میں ایک عظیم الشان قوت ہے۔ انسان ایک برقی ٹریم ہے، دماغ برقی چھڑی ہے۔ ارادہ برقی تاروں کا ایک سلسلہ ہے جو اس کے اوپر پھیلا پڑا ہے۔ انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ برقی چھڑی سے ارادے کے تاروں کو چھولے، حرکت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ پر زور خواہش اور اٹل ارادے جس انسان کے اندر موجود ہیں وہ عالی ہمت اور بلند حوصلہ انسان ہے۔ زمانہ کے نشیب و فراز ایسے عالی ہمت اور بلند حوصلہ انسان کے آگے آخر کار سر تسلیم خم کر دیں گے۔ جو ان کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکاتا بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور تڑکی بہ تڑکی جواب دیتا ہے۔

عزیز نوجوانوں! یاد رکھو کہ ایسا انسان دنیا کے ناگوار واقعات سے نہیں گھبراتا وہ ہر قسم کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو بے پروائی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ یقین کرتا ہے کہ جو امور بظاہر ناگوار اور ناقابل برداشت معلوم ہوتے ہیں وہ حقیقت میں دیگر خوش آئند امور کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

ایک بڑے تجربہ کار حکیم کا قول ہے کہ ”مصیبتیں مصیبتیں نہیں ہیں۔ وہ ایک امتحان ہیں جس کا نتیجہ کامیابی بھی ہے اور ناکامی بھی مگر کامیاب صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ان سے مغلوب نہیں ہوتے۔“ ایک اور دانشمند مصنف لکھتا ہے کہ ”زور شور کی بارش ایک نعمت ہے جس پر کائنات کی زندگی کا مدار ہے۔ اگرچہ ایک صاحبزادے کی قیمتی اور پر تکلف پوشاک اس کے چھینٹوں سے بھیگ جائے، کیا اس

سے بارش کے فوائد میں کمی واقع ہوگی۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح مصائب و آلام خدا کی نعمتیں ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ان کے ظاہری جوش و خروش سے ہم ناک بھوں نہ چڑھائیں۔“

علمی اخلاق کے ماہرین نے ہدایت کی ہے کہ مصیبت کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھنا چاہیے اور اپنے مطمح نظر پر جو یقین ہے اس میں کسی طرح کا تزلزل نہیں آنا چاہیے۔ یقین رکھنا چاہیے کہ مصیبت کا بادل چھٹ جانے کے بعد کامیابی کی روشنی ضرور جلوہ گر ہوگی۔ کسی مصیبت یا کسی تکلیف کا شکوہ نہیں کرنا چاہیے کہ شکایت اور شکست دونوں لفظوں کے ایک معنی ہیں۔ یعنی اگر شکایت کرتے ہو تو یقین کر لو کہ تم اپنے پیش نظر میدان سے ہٹ گئے اور تم نے اپنی شکست مان لی۔ شکایت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تم جو اپنے مقصد پر یقین رکھتے تھے اب اس یقین میں خلل آ گیا۔ حالانکہ یقین ہی وہ چیز ہے جس میں کامیابی کا راز مضمر ہے۔ کارپردازانِ قضا و قدر نے قلوبِ انسانی میں ایک زندہ چنگاری مخفی رکھی ہے جو خواہش کی تحریک سے مشتعل ہوتی ہے۔ اگر اس کی طرف سے غفلت کی جائے تو وہ چنگاری بجلاتی اور بالآخر بجھ جاتی ہے۔ اس چنگاری کے زندہ رکھنے کے لیے صرف ایک چیز ہے اور وہ یقین و اعتقاد ہے۔ ارادہ اس کا ایندھن ہے جب یہ غذا اس کو ملتی ہے تو اس کی ترقی کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں رہتی۔ مزاحمت کی لوہالاٹ دیواریں اور رکاوٹ کی سنگلاخ چٹانیں و اعتقاد کے مقابلے میں پرکاش سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ ہمت و استقلال اسی حالت کا نام ہے۔

اگر منزل مقصود پر پہنچنے کی آرزو ہے تو اس سے پہلے ہر نو جوان کو سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا میں کوئی شے مفت نہیں ملتی۔ باقاعدہ اور جاں کاہ محنت کے بغیر کامیابی ایک خواب ہے جس کی تعبیر ناکامی اور نامرادی کے سوا کچھ نہیں۔ پس ضروری ہے کہ ہر نو جوان اپنے اوقات کو کام میں مشغول رکھے، بے کاری میں زندگی بسر نہ کرے۔ اس کو یقین کرنا چاہیے کہ کام زندگی ہے اور بے کاری موت ہے۔ سکون اور افسردگی حرام ہے۔ نچلا بیٹھنا خطرناک ہے۔ ہر نو جوان کو اپنے پیش نظر مقصد کے لیے ہمیشہ ہمت اور کوشش میں مشغول

رہنا چاہیے۔ یہ کوشش مجنوں کی سی ہو۔ گذشتہ زمانے میں بھی جو نامور انسان اپنے مقصد کے لیے ایک خاص دھن میں مشغول رہے ہیں ان کو دنیا نے مجنوں کہا ہے اور مجنوں سمجھا ہے مگر ایک انشا پر داز لکھتا ہے کہ ”ایسے ہی مجنوں کی ضرورت دنیا کو ہے۔“ تمدن کی عظیم الشان عمارت کی بنیاد انھیں مجنوں نے اٹھائی تھی۔ اگر یہ مجنوں نہ ہوتے تو دنیا ترقی کی منزل میں ایک قدم آگے نہ بڑھتی ایسے ایک مجنوں کی دھن پر ہزاروں ہوشیار اور عقل مندوں کی عقل و حکمت قربان کر دینی چاہیے۔ قافلے کے قافلے گہری اور میٹھی نیند میں پڑے ہوتے ہیں۔ مگر یہ مجنوں اس وقت بھی تگ و دو میں سرگرم نظر آتے ہیں ان کو آوازِ جرس کی ضرورت نہیں ہے۔ دل کی آواز ہی ان کو ہر وقت جگاتی اور آگے بڑھاتی رہتی ہے۔ وہ رستے کے خطرات سے نہیں گھبراتے بلکہ خطرات کو خود طلب کرتے ہیں تاکہ ان میں پڑ کر نفس کی تربیت ہو، وہ مشکلات سے خوفزدہ نہیں ہوتے بلکہ مشکلات کو خود دعوت دیتے ہیں کہ وہ آئیں اور ان کو زندگی اور گرم جوشی کا سبق دیں۔ نا کامیوں کا وسوسہ ان کے دلوں میں نہیں آتا۔ اگر نا کامیاں ان کو پیش آتی ہیں تو وہ ان سے لڑتے ہیں، آگے بڑھتے ہیں۔ وہ اپنی دھن میں موت کی بھی پروا نہیں کرتے۔ ذوقِ طلب میں وہ برابر آگے بڑھتے ہیں اور اپنے سفر سے نہیں اکتاتے۔ جوں جوں چشمہٴ زندگی کے قریب پہنچتے ہیں ان کی پیاس تیز ہوتی جاتی ہے۔ وہ غم اور مایوسی سے کبھی دوچار نہیں ہوتے۔ ان کی نظر امید کے ستارے پر رہتی ہے جو ہمیشہ ان کی آنکھوں کے سامنے افق پر چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔

عزیز نوجوانو! یاد رکھو کہ ہماری خوشی اور ناخوشی بلکہ خود ہماری ہستی خیال کے تابع ہے۔ ہم کیا ہیں؟ سر سے پاؤں تک خیال کے پتلے ہیں۔ کائنات میں خیال سب سے بڑی قوت ہے اور جس چیز کا نام عمل ہے وہ اس کا پیرو ہے جو سایہ کی طرح اس کے جلو میں چلنا اپنے لیے باعثِ فخر جانتا ہے۔ ہر خیال اپنے موافق خیال کو اپنی طرف کھینچتا ہے ہمت افزا خیالات میں کامیابی کا راز مضمر ہے اور ہمت شکن خیالات نامرادی اور نا کامی کی ذمہ دار ہیں۔

گار فیلڈ کا قول ہے ”اس مغالطہ میں نہ رہو کہ قسمت تمہاری تلاش کر رہی ہے۔ سچ یہ کہ تم خود قسمت کی تلاش میں ہو۔ اگر تم وہ تمام شرطیں پوری کر دو جو خوش قسمتی کے لیے ضروری ہیں، پھر قسمت کی دیوی ضرور تم پر مہربان ہوگی۔“

یاد رکھو کہ کامیابی اتفاقی اور اضطراری نہیں ہے بلکہ قانون کی پابندی کا لازمی نتیجہ ہے۔ لوگ جس کو محض بخت و اتفاق کہتے ہیں، قوانینِ فطرت کی فہرست میں اس کا کہیں نام نہیں۔ تم جو کچھ ہو کسی نہ کسی قانون کی پابندی کا لازمی نتیجہ ہو۔ لازم ہے کہ خود اپنی ذات پر بھروسہ کرو۔ غیر تمہیں نہ بنا سکتے ہیں نہ بگاڑ سکتے ہیں۔ تمہاری کامیابی اور ناکامی کی کنجیاں خود تمہاری جیب میں ہیں۔ اگر تم مسرت و انبساط کی تلاش میں ہو، اگر تم فارغ البالی اور خوش اقبالی کا سراغ لگا رہے ہو تو یہ سب کچھ تمہارے دل کے اندر موجود ہے، دل کے دروازے پر دستک دو فوراً تمہاری دستک کا جواب ملے گا۔ الہامی صدا بھی یہی ہے کہ ہر آن انسان کی کامیابی اس کی ذات پر ہے۔ ہر انسان جیسی کوشش کرے اس کا ویسا ہی نتیجہ حاصل کرتا ہے۔

اے شریف نوجوانو! جب تم اپنی دھن میں مشغول ہو غم اور خوف کو اپنے پاس نہ آنے دو۔ کسی کو آزار پہنچانے کا خیال دل میں ہرگز نہ لاؤ۔ محبت سے ہر شخص کو یاد کرو عداوت اور حسد کے خوفناک جذبات کو اپنے سے دور رکھو، نیکی سے ہر شخص کے ساتھ پیش آ سکتے ہو، بدی سے کسی کے ساتھ نہیں۔ تمہارے نغمہ زندگی کے الفاظ حسب ذیل ہونے چاہئیں۔

”میں اس عالمگیر شعور کا ایک جز ہوں جو روح عالم ہے اس لیے میں زندگی ہوں۔ میں صحت و تندرستی ہوں۔ میں اتحاد و اتفاق ہوں، میں موسیقی ہوں، میں مسرت و انبساط ہوں، میں کامیابی اور خوش نصیبی ہوں، میرا قلب بلند خیالات کا خزانہ ہے اس لیے اغیار کے پست خیالات مجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میرے دل میں کسی کی طرف سے کدورت نہیں۔ اس لیے میں نہ تو کسی کو آزار پہنچانا چاہتا ہوں اور

نہ کسی سے خائف ہوں۔ میں ہر شخص کو محبت سے یاد کرتا ہوں۔ میری خواہش اور مراقبہ دونوں زبردست ہیں اس لیے میں کامیاب ہوں۔ میں اپنی خواہش اپنے ارادے اور اپنے خیالات کا نتیجہ ہوں میرے اعمال و افعال، میری خواہش، میرا ارادہ اور میرے خیالات مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ترقی کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ اگر ہے تو یہ میرا تصور ہے۔“

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
خدا نہ کرے، خدا کی پناہ	حاشا و کلا
بے جا حمایت، طرفداری	تعصب
اٹل، مضبوط	لاجب
پکا ارادہ	عزمِ راسخ
کھٹاس، کھٹائی	ثرشی
یورپین دانشمند، مغربی مفکرین	دانا یا ان فرنگ
روزمرہ مشق، کسی کام کو ہمیشہ کرنا	مُزاولت
حرکت دینے والا، اکسانے والا	مُحرک
لہریں اٹھنا	تموج
سپردگی، داخل کی گئی	ودیعت
اُتار چڑھاؤ	نشیب و فراز

گھنٹا، گھڑیال	جرس
بجلی سے چلنے والی گاڑی	برقی ٹریم
رنجش، دل کا غبار	کدورت
تکلیف، ایذا	آزار

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ مضمون 'خطاب بہ طلبا' کے مصنف کا نام بتائیے۔
- ۲۔ مولانا وحید الدین سلیم کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
- ۳۔ اس مضمون میں وحید الدین سلیم نے کس کو مخاطب کیا ہے؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ علمی اخلاق کے ماہرین نے مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے طلبا کو کیا ہدایات کی ہیں؟
- ۵۔ وحید الدین سلیم نے خواہش کی کیا تعریف بتائی ہے؟
- ۶۔ مصیبتوں کے متعلق تجربہ کار حکیم کا کیا قول ہے؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ مولانا وحید الدین سلیم کے حالات زندگی مختصراً تحریر کیجیے اور ان کی نثر نگاری پر روشنی بھی ڈالیے۔
- ۸۔ سلیم کے مضمون، خطاب بہ طلبا، کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

طنز و مزاح: ایک تعارف

طنز و مزاح کو عموماً ایک صنفِ ادب سمجھنے کی روایت چلی آرہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طنز و مزاح ادبی صنف نہ ہو کر اسلوب، طرز یا تکنیک کا نام ہے جس کی دیگر شعری و نثری اصناف کی طرح کوئی ہیئت یا ڈھانچا مقرر نہیں ہے۔ طنز اور مزاح کو اکثر ایک مرکب لفظ کے طور پر استعمال کرنے کی روایت بھی پرانی ہے۔ جب کہ یہ دونوں لفظ الگ الگ ہیں اور جن کے معنی، مقصد اور طرز بیان میں بھی معمولی سا فرق ہوتا ہے۔

طنز کے لغوی معنی ”طعنہ“ کے ہیں۔ لیکن اصطلاحِ ادب میں طنز کے لیے لعن طعن، تمسخر، ہجو اور تنقیص جیسے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے ’SATIRE‘ اور ہندی میں ’0; x‘ کہا جاتا ہے۔ طنز کا بنیادی مقصد کسی کی دل آزاری، ہنسی اڑانا یا تکلیف پہنچانا نہ ہو کر اصلاح کرنا ہوتا ہے۔

مزاح کے لغوی معنی ”خوش طبعی“ بتائے گئے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے ’HUMOUR‘ اور ہندی میں ’gkl;‘ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ طنز کی طرح مزاح کی بھی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔

طنز و مزاح اگرچہ معنی و مفہوم کے لحاظ سے الگ الگ ہیں لیکن مقصدی اور افادی طور پر دونوں لازم و ملزوم ہونے کے سبب چولی دامن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ طنز اور مزاح مشترک طور پر ہزل، ہجو، تضحیک، نوک جھونک، پھبتی، ضلع جگت، لعن طعن، پیروڈی اور فنٹاسی وغیرہ کے حوالے سے مل جل کر اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ لطیفہ سازی، چٹکلے بازی، چھچھور پن، چھیڑ چھاڑ، ٹھٹھولی، جنسی چٹخارے اور پھکڑ پن کا شمار طنز و مزاح میں نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ ان میں عریانیّت، رکاکت اور ابتذال کے پہلو شامل ہوتے ہیں۔

اردو میں طنز و مزاح کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس کی ابتداء شاعری میں ہوئی۔ طنز و مزاح کا دور اَوّلین ہجو نگاری کی صورت وجود میں آیا۔ مشہور ہجو نگار میر جعفر زٹی کو طنز و مزاح کا پہلا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ زٹی کو بعض مؤرخین اور ناقدین نے باغی، خود سمر اور دوسروں کی دل آزاری کرنے والا شاعر قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زٹی کے یہاں طنز کا پہلو خاکہ اڑانے اور تیکھی ضرب لگانے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔

ہجو نگاری میں محمد رفیع سودا کا نام بھی اہم ہے۔ سودا کے عہد کے لوگ شہر کے کوتوال کے بجائے سودا کے قلم سے ڈرتے تھے۔ سودا جب کسی پر بگڑتے تھے تب ہجو کہہ کر اسی کی بخیہ ادھیڑ دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی مشہور تخلیق ”تضحیک روزگار“ کا حوالہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

لکھنؤ میں انشاء، مصحفی اور جرأت نے طنز و مزاح کے لیے ہجو نگاری اور ریختی گوئی کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ان شاعروں میں معاصرانہ چشمکیں ہوا کرتی تھیں جو اکثر معرکہ آرائی کی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ ان شعرا کے علاوہ سعادت یار خاں رنگین، جان صاحب اور نازنین جیسے شاعروں نے بھی ریختی گوئی کو فروغ دے کر طنز و مزاح نگاری کو مالا مال کیا۔

نظیر اکبر آبادی کی منظومات اور ہجویات بھی طنز و مزاح نگاری کا اہم حصہ ہیں۔ انھوں نے انسانی کمزوریوں اور خرابیوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

مرزا غالب اور ان کے معاصرین کا دور صحت مندانہ طنز و مزاح کے لیے مثالی نمونے پیش کرتا ہے۔ غالب کی شاعری اور خطوط میں طنز و مزاح کی چاشنی اپنا منفرد ذائقہ دیتی ہے۔ غالب کی گدگدانے والی شوخی و ظرافت اور بذلہ سنجی کے پیش نظر حالی نے انھیں ”حیوان ظریف“ کہا ہے۔

اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو ۱۸۷۷ء میں ”اودھ پنچ“ نامی اخبار کے جاری ہونے سے تقویت ملی۔ اس اخبار کے مدیر سجاد حسین نے اردو کے شعرا اور نثر نگاروں سے اس اخبار کے لیے لکھنے کا مطالبہ کیا

تو پنڈت تر بھون ناتھ بھجر، احمد علی شوق، عبدالغفور شہباز، پنڈت رتن ناتھ سرشار، اور اکبر الہ آبادی جیسے اہل قلم کی طنزیہ و مزاحیہ تحریریں نئی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آئیں۔ بھجر کی تحریف اور پیروڈی تو شوق کی فہمہ زار تخلیقات تاریخی اہمیت و حیثیت کی حامل ہیں۔ شہباز نے اپنے وسیع مطالعے کی بنیاد پر مذہب، سیاست اور معاشرے کے بگڑے ہوئے حالات پر بھرپور طنز کیا۔

”لسان العصر“ اکبر الہ آبادی اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں سب سے الگ اور انفرادی پہچان اور مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے مغرب زدہ لوگوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ سرسید کے تعلیمی پروگرام پر انکی حملہ آور نظمیں تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں ”واعظ اور سید“، ”برق کلیسا“، ”در بار دہلی“، ”ایک شکایت“ اور ”لندن میں جا کے کر لیا اک بت سیمیں سے عقد“ طنز و مزاح کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اکبر نے اپنے کلام میں انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔

ظریف لکھنوی، علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور ظفر علی خاں کی طنزیہ تخلیقات اردو ادب کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ جوش ملیح آبادی، راجہ مہدی علی خاں، ضمیر جعفری، مجید لاہوری، سید محمد جعفری، مخمور جالندھری وغیرہ نے اردو ادب کو طنز و مزاحیہ تحریروں سے گہرا کیا۔

شاعری سے قطع نظر اردو نثر میں بھی طنز و مزاح کی مستحکم روایت تاریخ ادب اردو کے روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ابتدا میں اردو نثر میں جو طنزیہ و مزاحیہ ادب تخلیق ہوا اس میں محض ٹھٹھولی اور فقرہ بازی ہوا کرتی تھی۔ اردو میں طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش داستانوں میں ملتے ہیں۔ ان داستانوں میں ”فسانہ عجائب“ (رجب علی بیگ سرور) ”طوطا کہانی“ (حیدر بخش حیدری) ”رانی کیتکی کی کہانی“ (انشا) ”نورتن“ (مہجور) ”داستان امیر حمزہ“ اور ”بوستان خیال“ وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا غالب نے اپنے خطوط کے ذریعے اردو کے نثری ادب کو طنز و مزاح کے سلسلے میں معیار و وقار عطا کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں طنز و مزاح کی جھلکیاں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ رتن ناتھ سرشار نے

”فسانہ آزاد“ کے ذریعہ لطافت، حاضر جوابی، پھبتی اور بذلہ سنجی کو فروغ دیا۔ سجاد حسین نے کالم نگاری کے ذریعے طنز و مزاح کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے معاصرین میں مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی کسمندوی اور عمر آزاد، دلاور فگار اور چراغ علی حسرت وغیرہ کی تحریریں ظرافت نگاری میں خاص مقام رکھتی ہیں۔

اردو ادب میں ایک ایسا عبوری دور بھی آیا جب نثر نگاروں نے طنز و مزاح کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ اس عہد کے اہل قلم میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے ظرافت نگاری کو معراج کمال عطا کی۔ ان کی تحریر کردہ ”نذیر احمد کی کہانی: کچھ ان کی، کچھ میری زبانی“ اور ”مضامین فرحت“ اس سلسلے کی مضبوط کڑیاں ہیں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے معاشرے کی اصلاح کے لیے ”چمکی“، ”شریر بیوی“، ”کولتار“ اور ”خانم“ جیسی تحریریں پیش کیں۔ ملا رموزی جنھیں ”گلابی اردو“ کا موجد کہا جاتا ہے، نے طنز و ظرافت کو فطری انداز بخش کر ادب لطیف کو نیا موڑ دیا۔ پطرس بخاری کے مزاحیہ مضامین اپنے عہد کی بے راہ روی پر گہرا طنز کرتے ہیں، اس ذیل میں ”مضامین پطرس“ اپنی مثال آپ ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ”مضامین رشید“، ”آشفقہ بیانی میری“ اور ”طنزیات و مضحکات“ وغیرہ میں مزاح نگاری کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ شوکت تھانوی کا افسانہ ”سودیشی ریل“ ان کی شہرت کا وسیلہ بنا۔ ”موجِ شبّانم“، ”بحر تبسم“، ”طوفان تبسم“، ”کارٹون“، ”جوڑ توڑ“ اور ”سسرال“ کے توسط سے انھوں نے میدانِ طنز و مزاح میں اپنی حاضری درج کرائی۔ کنھیالال کپور کا تیز دھار والا طنز سماج اور حالات کے بگڑے ہوئے روپ کی چیر پھاڑ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان مصنفین کے علاوہ کرشن چندر، فرحت کا کوروی، غلام عباس، قدرت اللہ شہاب، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، انتظار حسین، ابن انشا، کرنل محمد خاں، احمد جمال پاشا، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت، نظیر صدیقی، غلام جیلانی اور مجتبیٰ حسین وغیرہ طنز و مزاح نگاروں نے اردو طنز و مزاح نگاری کی تاریخ کو مضبوطی اور استحکام عطا کیا۔

پطرس بخاری

پطرس بخاری کا اصل نام سید احمد شاہ بخاری تھا، لیکن وہ پطرس بخاری کے قلمی نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ پطرس کی ولادت یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو بمقام پیشاور ہوئی۔ ان کے والد سید اسد اللہ شاہ بخاری نے پطرس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ صرف کی۔ چنانچہ پطرس نے ابتدائی تعلیم پیشاور میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اس کالج سے آپ نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا۔

کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر پطرس مزید تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئے۔ وہاں انھوں نے کیمرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور کئی برس تک قیام کیا۔ بقول نور الحسن نقوی پطرس بخاری ”یہاں بھی اپنی ذہانت اور ذوق مطالعہ کے سبب ہم جماعتوں میں سر بلند رہے۔“ انگلستان سے واپسی پر پطرس گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب کے پروفیسر اور کچھ دنوں پرنسپل مقرر ہوئے۔

۱۹۳۷ء میں پطرس آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں اقوام متحدہ (یو۔ این۔ او۔) کے شعبہ اطلاعات میں جنرل سیکریٹری منتخب ہو کر اپنی خدمات انجام دینے لگے۔ پطرس کی انگریزی ادب میں مہارت کے پیش نظر کولمبیا یونیورسٹی نے انہیں انگریزی کے پروفیسر کا عہدہ پیش کیا لیکن صدر فوسوس کہ ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا اور یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا۔

پطرس بنیادی طور پر انگریزی کے ادیب تھے لیکن اپنے دوستوں کے اصرار پر انہوں نے اردو میں مزاحیہ افسانے لکھنا شروع کیے۔ پطرس کو اردو میں بہ حیثیت مزاح نگار شہرت ملی۔ ان کی مزاح نگاری

پر مغربی مزاح نگاری، خصوصاً انگریزی ادب کی مزاح نگاری کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ پطرس کے زیادہ تر مضامین انگریزی مضامین کا ترجمہ اور چربہ ہیں۔

پطرس نے اگرچہ بہت کم لکھا لیکن جو لکھا عمدہ لکھا۔ ان کے مضامین کا ایک مختصر مجموعہ 'مضامین پطرس' کے زیر عنوان شائع ہو کر مشہور ہو چکا ہے۔ ان کے مضامین میں 'لاہور کا جغرافیہ'، 'مرحوم کی یاد میں'، 'ایک وصیت کی تعمیل'، 'مرید پور کا پیر' اور 'ہاسٹل میں پڑھنا' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مضامین پطرس کے علاوہ 'تعلیم خصوصاً اوائل طفلی میں'، 'نوع انساں کی کہانی'، 'دیہات میں بوائے اسکاؤٹ کا کام' اور 'مصر کی رقاصہ' بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

مضمون 'سویرے جو کل آنکھ میری کھلی' میں پطرس نے ایسے نوجوانوں پر بھرپور طنز کیا ہے جو صرف خیالی منصوبے بناتے ہیں۔ ان کی خواہش اور تمنا تو بہت کچھ کرنے کی ہوتی ہے لیکن وہ اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ نہیں پہنچاتے۔

مصنف نوجوانوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ زندگی صرف خواہشوں اور تمناؤں سے عبارت نہیں۔ کامیابی اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے حرکت و عمل بے حد ضروری ہے۔ یہ مضمون سادگی و سلاست، طنز و ظرافت، شفقگی و شائستگی، شوخی روانی اور بے ساختگی کے سبب پطرس کے کامیاب اور نمائندہ مضامین میں شمار ہوتا ہے۔

پطرس بخاری

سویرے جوکل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے، ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپاشنکر جی برہم چاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آئے جاتے ہیں، آپ سحر خیز ہیں ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیجیے گا۔

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے بھوکے بیٹھے تھے دوسرے دن اٹھتے ہی انہوں نے ہمارے دروازے پر مکے بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر ہم سمجھے کہ خواب ہے، ابھی سے کیا فکر کرنا، جب جاگیں گے لاجول پڑھ لیں گے، لیکن گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب، جب کمرے کی چوٹی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب بھی دروازہ ہے کہ لگا تار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا، میرے آبا و اجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ بھی جاگ اٹھی ہوگی۔ بہتیری آوازیں دیتا ہوں..... اچھا.....

اچھا..... تھینک یو..... جاگ گیا ہوں..... بہت..... اچھا..... نوازش..... آں جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا کس آفت کا سامنا ہے! یہ سوئے ہوئے کو جگا رہے ہیں یا مُردے کو جلا رہے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ بھی تو واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں ”قم“ کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ مُردے کے پیچھے لٹھ لے کر تھوڑی ہی پڑ جاتے تھے؟ تو پین تھوڑی داغنتے تھے؟ یہ ہم سے کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹنی کھول دیتے؟ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بھانا پڑتا ہے، اس کا اندازہ بس اہل ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھا۔ اب جو ہم نے کھڑکی اور روشن دان میں سے چاروں طرف دیکھا

اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں ان میں سے ایک بھی نظر نہ آئی، تو فکر سا ہو گیا کہ آج سورج گرہن نہ ہو! سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی: لالہ جی!..... لالہ جی! جواب آیا ”ہوں“

میں نے کہا: ”آج کیا بات ہے کہ اندھیرا اندھیرا سا ہے۔“

کہنے لگے: ”تو اور کیا تین ہی بچے سے سورج نکل آئے۔“

تین بچے کا نام سن کر ہوش اڑ گئے، چونک کر پوچھا: ”کیا کہا تم نے؟ تین بچے ہیں؟“ کہنے لگے:

تین..... تو..... نہیں..... کچھ..... سات..... سات... ساڑھے سات منٹ اوپر تین ہیں۔“

میں نے کہا: ”ارے کبخت، خدائی فوج دار، بدتمیز کہیں کے! میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح

جگا دینا، یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بچے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی

ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بچے ہم اٹھ سکا کرتے تو آج دادا جان کے منظور نظر نہ ہوتے؟ تین بچے

اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں کہ کوئی مذاق ہے؟ لا حول ولا قوۃ۔“

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد کو خیر باد کہہ دوں، مگر پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکا تو

کوئی ہم نے لے نہیں رکھا ہے، ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لمپ بجھایا اور بڑ بڑاتے ہوئے پھر سو گئے اور

پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح دس بجے اٹھے، بارہ بجے تک منہ ہاتھ دھویا

اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوٹل میں وارد ہوئے، شام کا رومان انگیز وقت، ہوا بھی نہایت لطیف تھی، طبیعت

بھی ذرا مچلی ہوئی تھی، ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ اتنے میں ایک پڑوسی کی

آواز آئی: ”مسٹر!“

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے، بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ

گئے۔ ارشاد ہوا ”آپ گارہے ہیں؟“ زور ”آپ“ پر۔

میں نے کہا: ”اجی میں کس لائق ہوں، لیکن خیر فرمائیے؟“

بولے ”ذرا..... وہ..... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں.....“

بس صاحب موسیقیت کی روح ہم میں فوراً مرگئی، دل نے کہا ”اونا بکار انسان! دیکھ پڑھنے

والے یوں پڑھتے ہیں۔“

صاحب! خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ”خدا یا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے

والے ہیں، ہماری مدد کرا اور ہمیں ہمت دے۔“

آنسو پونچھے اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے، دانت پیس لیے، نکلٹائی کھول دی،

آستینیں چڑھالیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد، سبھی قسم کی کتابوں کا انبار پڑا

تھا، اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ

مطالعے کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علاحدہ رکھ دیا، چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ کھڑا کر دیا،

ایک نوٹ پیپر پر کتاب کے صفحات کی تعداد کو دونوں کی تعداد پر منقسم کیا، ساڑھے پانچ سو جواب آیا۔ لیکن

اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین بجے کیوں

نہ اٹھ بیٹھے، لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ پر ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ

تین بجے تو لغوبات ہے، البتہ پانچ چھ سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے

گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی، ہم خرم اور ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اٹھنا ہے تو جلدی ہی سونا چاہیے۔ کھانا باہر ہی کھا آئے تھے

بسترے میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں۔ یوں تو ہماری قوتِ ارادی کافی

زبردست ہے جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں، لیکن پھر بھی کیا حرج ہے ڈرتے ڈرتے آواز دی: ”لالہ جی!“
انہوں نے پتھر کھینچ مارا: ”لیس!“

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ ”لالہ جی! صبح
آپ کو بڑی تکلیف ہوئی، میں آپ کا بہت ممنون ہوں، کل ذرا مجھے چھبے، یعنی جس وقت چھبیں.....
جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا: ”جب چھب چکیں..... سنا آپ نے؟“

چپ۔

لالہ جی!“

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا: ”سن لیا چھبے جگا دوں گا۔“

ہم نے کہا: ”ب‘ب‘ اچھا، یہ بات ہے۔“

”تو بہ خدا کسی کو محتاج نہ کرے!“

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھبے انہوں نے
دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا، ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ
یہ خواب ختم ہو لے تو ابھی جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ہی ایک دو منٹ کے بعد آنکھیں کھول
دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہوں نے اس صورت میں قبول
کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں ذرا اختلاف ہے۔
بہر حال اس کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں، پھر یہ بھی یاد
ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا اور پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پہلے

دیباچے کہ طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی اور پھر کانہیں پتا۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا یا شاید سر کو اس میں لپیٹ لیا، شاید کھانسا، کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ یہ یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے۔ لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے، جس میں نہ آپ ماہر نہ ہم۔ کیا پتا لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں! لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب! شرافت ملاحظہ ہو، محض اس شہسبے کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا اور اپنے آپ کو کوستار ہا، مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں، ان کا شکر یہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو، حد درجہ کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا ورنہ آج بھی اور دنوں کی طرف دس بجے اٹھتا۔ لالہ جی! صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے، جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجب چیز پیدا کی ہے، یعنی اگر صبح کے بجائے شام ہو جایا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا!“

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی دادیوں دی کہ آپ پوچھنے لگے: ”تو میں آپ کو چھ بجے جگا

دیا کروں نا؟“

میں نے کہا: ”ہاں ہاں، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ بے شک۔“

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعے کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ رکھ دیں، کرسی کو چار پائی کے نزدیک سرکا لیا، اور کوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا، کنٹوپ اور دستا نے پاس ہی رکھ لیے، دیا سلائی کو تیکے کے نیچے ٹٹولا، تین دفعہ آیینہ الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک ارادہ کر کے سو گئے۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی، نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک

کھڑکی میں سے ان کو ”گڈ مارنگ“ کہا اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے، دل سے کہا کہ ”دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے، ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔“ دل نے کہا: ”اور نہیں تو کیا تمہارے یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔“ ہم نے کہا: ”سچ کہتے ہو یار! یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی مجال کیا ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت لاہور میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا اور مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار اور سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔“

ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سالخاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے..... ”خوب“ تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں؛ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے، ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بے چارہ یہی کہتے کہتے مر گیا، مگر ہمارے کان پر جوں تک نہ رہینگی۔ (لحاف کانوں پر سرک آیا.....) تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں..... بہت پہلے..... کیا بات ہے؟ خداوندان کالج بھی کس قدر مستعد انسان کو چھبے تک قطعاً جاگ اٹھنا چاہتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے..... (لحاف سر پر)..... بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قدروں کی بیخ کنی کر رہی ہے، عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے..... (آنکھیں بند)..... تو ابھی چھ بجے ہیں، گویا تین گھنٹے متواتر مطالعہ کیا جاسکتا ہے، سوال صرف یہ ہے کہ پہلے

کون سی کتاب پڑھیں، شیکسپیر یا ورڈزورٹھ؟ ”میں جانوں شیکسپیر بہتر ہوگا، اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر کیا چیز ہو سکتی ہے!“ پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈزورٹھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا اور دل و دماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے..... لیکن شیکسپیر..... نہیں ورڈزورٹھ ہی ٹھیک رہے گا..... مگر شیکسپیر..... ہیملٹ..... لیکن ورڈزورٹھ..... لیڈی میکبیتھ..... دیوانگی..... سبزہ زار..... باہاری..... صید ہوس..... کشمیر..... میں آفت کا پرکالہ ہوں.....“

یہ معما اب فلسفے ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے باہر سر نکالا اور ورڈزورٹھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے، اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے۔

کالج ہال میں لالہ جی ملے کہنے لگے: ”مسٹر! صبح میں نے آپ کو آواز دی تھی آپ نے کوئی

جواب نہ دیا؟“

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا: ”اوہ لالہ جی! یاد نہیں میں نے آپ کو گنڈ مارنگ کہا تھا؟ میں تو پہلے

ہی سے جاگ رہا تھا۔“

بولے: ”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن بعد میں..... اس کے بعد..... کوئی سات بجے کے قریب میں نے

آپ سے تاریخ پوچھی تھی، آپ بولے ہی نہیں۔“

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا، گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں اور پھر متین چہرہ بنا کر

ماٹھے پر تیوری چڑھائی اور غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔ پھر

یکا یک ایک مجھو بانہ انداز سے مسکرا کر کہا: ”ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ میں اس وقت.... اے.... نماز پڑھ

رہا تھا۔“ لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیے اور ہم اپنے زہد و اتقا کی مسکینی میں سر نیچے ڈالے کمرے کی

طرف چلے آئے۔

اب یہ ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا۔ جاگنا نمبر ایک چھبے بجے۔ جاگنا نمبر دوس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دل مرحوم ایک جہان آرزو تھا تو جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ہمارا فرقِ نازمِوِ بالمش کم خواب ہو اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُریچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھول کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے برہم کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں۔ اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک آواز مسکراتی گارہی ہو۔ ”تم جاگو موہن پیارے۔“ خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دل آویز تبسم کو اور بھی درخشندہ کر دے اور ”سانوری صورت توری من کو بھائی“ کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے۔

نصیب یہ ہے کہ پہلے مسٹر مسٹر کی آواز اور دروازے کی دنادن سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں دیگچوں کے الٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کلاسیاں اور غرغرے کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کر لیجیے کہ ان سازوں میں سرتال کی کس قدر گنجائش ہے۔

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
اطلاعات کا محکمہ، انفارمیشن کا ڈیپارٹمنٹ	شعبہٴ اطلاعات
اعلیٰ مرتبہ، سرفراز، ممتاز	سر بلند
ضد، تا کید	اصرار
مجاورہ، ارادہ کرنا، ٹھاننا، کسی بات کو دل میں پختہ کرنا	منصوبے بنانا یا باندھنا
برے دن، آنا، مصیبت آنا	شامت آنا
بہ طور	برسبیل
ذکر، چہرچہ، یادگار، بیان	تذکرہ
کہتے ہی فوراً کام کرنا	لفظوں کا بھوکا ہونا
مکے سے مارنا، گھونسا مارنا، دگ جڑنا	مکے بازی (مجاورہ)
ہوشیاری، جاگتے ہوئے	بیداری
غلطی تسلیم کرنا، کسی کو ماہر فن ماننا	قائل
باپ دادا، مورث	آباء و اجداد
سوئی ہوئی تقدیر	قسمتِ خوابیدہ
کرم، مہربانی، لطف، عنایت	نوازش
جناب والا، اعلیٰ قدر، مخاطب کو بجائے آپ کے	آنجناب
تعلیماً آنجناب کہتے ہیں	

آفت کا سامنا کرنا (محاورہ)	مصیبت آنا، قہر نازل ہونا، صدمہ پہنچنا
اہل ذوق	ذوق و شوق رکھنے والے لوگ
ہوش گم ہونا (محاورہ)	ہوش اڑنا
منظورِ نظر	عزیز، پیارا، محبوب، وہ شخص جس پر کسی کی عنایت ہو
عدم تشدد	بے توجہی، بے پرواہی، اہنسا
نوع انساں	بشر، انسان کی اولاد
اصلاح	صحت، درستی، نظر ثانی، تصحیح
حسب معمول	دستور کے مطابق، جو عمل روزانہ ہو
جوشِ شباب	جوانی کا جوش
ارمان انگیز	حسرت مند، آرزوؤں اور حسرتوں سے پُر
نہایت لطیف	بے انتہا پاک صاف
موسیقیت	جس میں لے اور سنگیت شامل ہو
آستین چڑھانا (محاورہ)	کام کے لیے مستعد ہونا، لڑنے کو تیار ہونا
نابکار	نکما، نالائق، بے کار
مطالعہ	غور، توجہ اور دھیان سے پڑھنا
سرخ	لال
سبز	ہرا
زرد	پیلا
تقطیع	کتاب کا سائز

اضطراب	بے قراری، بے چینی، بے تابی
کنجواہی	کم سونا، نیند نہ آنے کا مرض
طبی پہلو	حکمت اور علاج کی رو سے
ملامت	ڈانٹ، ڈپٹ، جھڑکی، دھتکار
معقول	مناسب، واجب، بجا، درست
ہم خرما و ہم ثواب (کہاوت اور مثل) وہ کام جس میں لذت بھی ہو اور جو کار خیز بھی ہو وہ کام جس میں دوہرا فائدہ ہو	
قوت ارادی	ارادے کی پختگی، ارادے کا پکا ہونا، گزارش
بحث طلب	حجت، دلیل، سوال و جواب
سہم جانا (محاورہ)	ڈر جانا، دم بخود ہو جانا
گولہ باری کرنا (محاورہ)	توپ کے گولے پھینکنا
نفسیات	نفسِ انسانی سے متعلق بات
مسئلہ	معاملے کی پیچیدگی، سوال، دینی بات
شبہہ	شک، گمان، وہم
ضمیر	دل، قلب
طمینیت	اطمینان، تسلی
جادو بیانی	جس کی بات، تقریر یا کلام میں تاثیر ہو
خندہ پیشانی کے ساتھ	ہنستے ہوئے، خوش مزاجی کے ساتھ، شگفتہ ہو کر
مطمئن	بے فکر، آسودہ، اطمینان پانے والا

اولوالعزمی	پکارادہ حوصلہ مندی، بلند ہمتی
اوسان خطا ہونا	حواس بجانہ رہنا، حواس جاتے رہنا
کسالت	سستی، کاہلی، کام چوری
خلل انداز	خلل ڈالنے والا، بیجا مداخلت کرنے والا
مزے اڑانا (مجاورہ)	لطف حاصل کرنا، عیش اڑانا
دنیا و ما فیہا	دنیا اور جو کچھ اس میں ہے
شگفتہ طبعی	خوش مزاج، ہنس مکھ
برخوردار	اقبال مند، صاحب نصیب، بیٹا، فرزند
سعادت امار	نیک بخت، فرماں بردار، خدمت گزار
مقدم	اعلیٰ، اونچا، معزز، برتر
روز بروز	آئے دن، ہر دن، پے در پے
الحاد	سیدھے راستے سے کتراجانا، حق سے پھر جانا
مستعد	آمادہ تیار، موجود، کمر بستہ
قطعی	واقعی، یقینی، کامل
عظیم الشان	بڑی شان و شوکت والا، بہت بڑا
تصانیف	تصنیف کی جمع، لکھی ہوئی کتابیں
لطف اندوز	جس میں لذت یا مزہ ہو
معمہ	مخفی، پوشیدہ، مہم، پھیلی
مابعد الطبیعات	الہیات، فوق الفطرت

زور سے ہنسنا، ٹھٹھا مار کر ہنسنا	قہقہہ لگانا
خوب سوچ سمجھ کر توجہ اور دھیان کے ساتھ	غور و فکر
مشغول کام میں لگا ہوا	مصروف
غور کرنا، گہرائی، باریک بینی	تعمق
اچانک، ناگہاں، دفعۃً	یکایک
رعب میں آیا ہوا، ڈرا ہوا	مرعوب
پرہیزگاری یا پارسائی، خدا کا خوف	زہد و اتقا
رواج، دستور، قاعدہ، وہ بات جو روزمرہ کی ہو	معمول
خواہش مندی، چاہت اور تمنا کی دنیا	جہان آرزو
صبح صادق نمودار ہونے کا وقت	بوائے سحری
گھل جانا، ہضم ہو جانا	تحلیل
خوش ذائقہ، دل پسند	خوش گوار
جادو، سحر	طلسم
شوق، آرزو یا تمنا بھری نگاہ	نگاہ اشتیاق
دل کو لبھانے والی مسکراہٹ	دل آویز تبسم
چمکتا ہوا، تاباں، نورانی	درخشندہ
اچھی آواز میں سنانا، خوش گلو	سامعہ نوازی

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ سبق ”سویرے جوکل آنکھ میری کھلی“ کے مصنف کے پڑوسی کا کیا نام تھا؟
- ۲۔ مصنف نے اپنے پڑوسی لالہ جی سے بر سبیل تذکرہ کیا کہا؟
- ۳۔ پطرس کے مضامین کا مجموعہ کس عنوان سے شائع ہوا؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ پطرس کی تاریخ ولادت اور وفات تحریر کیجیے۔
- ۵۔ پطرس کے دو مشہور مضامین کے عنوانات لکھئے۔
- ۶۔ سبق ”سویرے جوکل آنکھ میری کھلی“ میں مصنف نے کن کن انگریزی شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کیا ہے؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ سبق ”سویرے جوکل آنکھ میری کھلی“ میں استعمال ہونے والے محاروں کا مطلب لکھتے ہوئے انہیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔
- ۸۔ پطرس بخاری کی سوانح عمری لکھتے ہوئے ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے؟

قواعد : علم بدیع و بیان

کسی بھی زبان کو صحیح طریقے سے پڑھنے لکھنے اور سمجھنے کے لئے جو اصول بنائے گئے ہیں اسے قواعد کہتے ہیں۔ ان اصولوں کے ذریعہ صحیح زبان کا بولنا اور لکھنا آجاتا ہے۔

قواعد کے حصے: عام طور پر قواعد کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) حروف: اس حصہ میں حروف سے بحث ہوتی ہے۔

(۲) صرف: اس کے ذریعہ لفظ کی حقیقت اور اس کی مختلف شکلیں معلوم ہوتی ہیں اس کے جاننے سے الفاظ کا صحیح بولنا آجاتا ہے۔

(۳) نحو: اس سے الفاظ کی حقیقت اور جملوں میں ان کی ترتیب اور موقع محل کے لحاظ سے ان کے مفہوم کی معلومات ہوتی ہے اس کے ذریعہ الفاظ کا صحیح استعمال اور جملوں میں ان کی درست بندش کا سلیقہ آجاتا ہے۔ اسی طرح کلام کی خوبیوں کے علم کو علم بدیع اور علم بیان کہتے ہیں۔ جس کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) تشبیہ: اس صنعت کو کہتے ہیں جہاں ایک یا کئی چیزوں کو دوسری چیزوں سے کسی بات یا خوبی کی وجہ سے مثال دے کر مقابلہ کیا جائے۔ جیسے چاند سا چہرہ۔ یہاں چہرہ کا مقابلہ چاند سے کیا گیا ہے۔ اس کے پانچ اجزا ہوتے ہیں۔

(i) مشبہ: وہ شخص یا چیز جس کو تشبیہ دی جائے

(ii) مشبہ بہ: وہ شخص یا چیز جس سے تشبیہ دی جائے۔

(iii) حرف تشبیہ: وہ حرف یا حروف جو تشبیہ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہوں۔ جیسے: سا،

جیسا، مانند، نظیر، مثال وغیرہ۔

(iv) وجہ شبہ: وہ صفت جس میں تشبیہ دی گئی ہو۔ جیسے حامد شیر کے مثل ہے۔ اس میں حامد مشبہ ہے،

شیر مشبہ بہ ہے، مثل حرف تشبیہ ہے، اور بہادری وجہ شبہ ہے۔

میر تقی میر کے اس شعر میں دیکھئے کتنی خوبصورت تشبیہ ہے۔

ناز کی اُس کے لب کی کیا کہئے

پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں محبوب کے لب کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی ”لب“ مشبہ اور ”گلاب کی

پنکھڑی“ مشبہ بہ ہے۔ تشبیہ کے لئے لازم ہے کہ اس میں مشبہ اور مشبہ بہ ہوں۔

(۲) تلمیح: جہاں کسی آیت قرآنی یا حدیث یا مسئلہ یا تصور کا یا قصے کی طرف اشارہ ہو، جس کے

بغیر بات پوری طرح سمجھ میں نہ آئے۔ اس کو تلمیح کہتے ہیں۔ مثلاً۔

واقعات طور سے ملتا ہے ہم کو یہ پتہ

اس کا جلوہ عام بھی ہے اس کا جلوہ خاص بھی

یہاں کوہ طور کا حوالہ ہے۔ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کی تجلی دیکھی تھی۔

(۳) استعارہ: اس مجاز کو کہتے ہیں جس کے استعمال کرتے وقت حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا

تعلق ہو۔ مثلاً: بہادر کے لیے شیر کا لفظ استعمال کریں تو یہ استعارہ ہوگا۔

استعارہ میں ارکان تشبیہ کے نام:-

(i) مشبہ کی ذات کو مستعار منہ کہتے ہیں۔

(ii) جو لفظ اس کے لیے استعمال کیا جاتا ہے وہ مستعار کہلاتا ہے۔

(iii) مشبہ کو مستعار لہ، کہتے ہیں۔

(iv) وجہ شبہ جامع کہلاتی ہے، جیسے شیر کا لفظ مرد بہادر کے لیے استعمال کریں۔ تو مرد بہادر کی ذات مستعار لہ، لفظ بہادر مستعار، شیر مستعار منہ اور بہادری وجہ جامع ہوگی۔

اقبال کی نظم ”جگنو“ میں استعارہ کا استعمال دیکھیے۔

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی

نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

یہاں جگنو کو بطور استعارہ چاند کہا ہے۔

استعارہ کی قسمیں بلحاظ مشبہ اور مشبہ بہ کے حذف و ذکر کے دو ہیں

(i) استعارہ بالتصر: وہ معمولی استعارہ ہے جس میں (مشبہ بہ) مستعار منہ کا ذکر کیا گیا ہو اور (مشبہ) مستعار لہ، کا ذکر نہ ہو۔ جیسے

مصرع: ربط رہنے لگا اس شمع کو پروانوں سے

اس مثال میں صرف شمع اور پروانوں کا ذکر ہے مشبہ مستعار لہ، عاشق و معشوق کا کوئی ذکر نہیں۔

(ii) استعارہ بالکنایہ: وہ استعارہ ہے جس میں (مشبہ بہ) مستعار منہ کا ذکر نہ ہو۔ لیکن ایسی شکل

میں یہ ضروری ہے کہ مشبہ بہ کے مناسبات و لوازمات ضرور بیان کیے جائیں مثلاً

مصرع: نہیں ممکن کہ کلک فکر لکھے شعر سب اچھے

یہاں فکر کو منشی سے تشبیہ دی ہے (اور مشبہ بہ) مستعار منہ کا یعنی منشی کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن

کلک جو منشی کے لیے ضروری ہے اور مناسب ہے مذکور ہے۔

(4) ایہام (توریہ): کلام میں ایسے الفاظ کا لانا جس کے دو معنی ہوں۔ ایک قریب کے، دوسرے

دور کے۔ مگر کسی خاص وجہ سے دور کے معنی مراد لینے کو ایہام یا تو یہ کہتے ہیں۔ مثلاً۔

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن

آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

یہاں سایہ کے دو معنی ہیں (۱) قریب کے یعنی یہی سایہ جو دھوپ کی ضد ہے۔ (۲) دور کے معنی ہیں

حمایت یا پناہ اور یہاں بھی دور کے معنی (حمایت یا پناہ) مراد ہیں۔

(5) حسنِ تعلیل: وہ صنعت ہے جس میں کسی بات کا اصلی سبب تو کچھ اور ہو مگر شاعرانہ طور پر کچھ اور

سبب بیان کیا گیا ہو۔ مثلاً۔

ہو رہا ہے ہائے میرا ماتم تشنہ لبی

رو رہا ہے خود بخود شیشے سے مل کر جام بھی

چونکہ شراب بوتل سے گلاس میں ڈالی جاتی ہے مگر یہاں شاعرانہ طور پر شیشے سے جام میں شراب

لوٹنے کا ماتم سے تشبیہ دی ہے اور رونے سے مراد لی ہے۔

(6) مراعاة النظر: کلام میں ایسے دو الفاظ کا لانا جو تضاد یا ضد کے علاوہ کوئی اور بھی مناسبت رکھتے

ہوں۔ جیسے دریا، موج، طوفان۔ مثلاً۔

بادہ کیا، خم کیا، سبو کیا، جام کیا، پیمانہ کیا

کر گیا نظریں ملا کر کوئی مستانہ مجھے

یہاں بادہ، خم، سبو، جام، اور پیمانہ ان سب میں ایک نسبت تو یہی ہے کہ تمام شراب کے کام میں

آتے ہیں اور دوسرے معنی کی وجہ سے ان میں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ مگر ان سب کے یکجائی استعمال کی وجہ

سے معنی میں فرق نہیں آتا۔

حصہ نظم

ڈاکٹر شاہد الحق چشتی

غزل: ایک تعارف

غزل اردو شاعری کی سب سے مشہور اور ہر دل عزیز صنفِ سخن ہے۔ اردو کے تقریباً ہر شاعر نے اس صنفِ سخن میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ اردو شاعری کے سرمایے میں بیشتر حصہ غزل کا ہے۔ غزل عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کی پیدائش عربی قصیدہ سے ہوئی۔ قدیم عرب قصیدہ گوئی کرتے ہوئے قصیدہ کا آغاز تشبیہ سے کرتے تھے جس میں غزل کی ہیئت میں شعر قلم بند کیے جاتے تھے۔ اردو میں یہ صنف فارسی کے اثر سے آئی اور فارسی نے اسے عربی سے مستعار لیا۔

غزل کے لغوی معنی 'عورتوں سے باتیں کرنا' یا 'عورتوں کے حُسنِ جمال کی تعریف کرنا' ہے۔ لیکن اردو غزل کبھی بھی اپنے اس محدود معنی میں قید نہیں رہی۔ اردو شعرا نے اس صنف میں عورتوں کے حسن و جمال اور ان سے حسن و عشق کی باتوں کے ساتھ ہی دیگر موضوعات و خیالات پر بھی اپنے قلم کی جولانیاں بکھیری ہیں۔ شعراے اردو نے غزل میں مختلف کیفیات و جذبات مثلاً سیاسی، سماجی، معاشرتی مسائل کے ساتھ ہی مذہب، اخلاق، فلسفہ و تصوف، پند و نصائح کے نکات اور قدرتی مناظر و میدانِ جنگ کے واقعات تک بیان کیے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صنف میں شعرا نے ہر موضوع اور ہر میدان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ساخت یا ہیئت کے اعتبار سے غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔ جس کے دونوں مصرعوں میں ردیف اور قافیہ پایا جاتا ہے۔ (غزل کے لیے قافیہ لازمی ہے۔) کئی شعرا نے کچھ غزلیں بغیر ردیف کے بھی کہی ہیں۔ ایسی غزلیات غیر مردّف کہلاتی ہیں۔ مطلع کے بعد بھی اگر شاعر دیگر شعر/ اشعار کے دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ کا استعمال کرتا ہے تو ایسے شعر/ اشعار حُسنِ مطلع کہلاتے ہیں۔ غزل کے بقیہ

اشعار جن کے محض دوسرے مصرعوں میں ردیف و قافیہ ہو وہ 'بیت' یا 'فرد' کہلاتے ہیں۔
 غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ یعنی ہر شعر میں ایک مکمل بات یا خیال ہوتا ہے۔ معنوی اعتبار سے اس کا دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی شاعر کوئی مضمون یا خیال ایک شعر میں مکمل بیان نہیں کر سکتا ہے تو وہ اپنی بات مکمل کرنے کے لیے دوسرے شعر کا سہارا لیتا ہے۔ لہذا ایسے اشعار قطعہ بند شعر کہلاتے ہیں۔ غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے۔ جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ معنوی اعتبار سے غزل کے سب سے اچھے شعر کو 'بیت الغزل' کہتے ہیں۔ لیکن اس کا انتخاب غزل کہنے یا سننے والے پر منحصر ہوتا ہے۔ غزل میں اشعار کی کوئی قید نہیں۔ ایک مکمل غزل میں کم سے کم پانچ اشعار ہوتے ہیں۔ اس سے کم پر وہ غزل نامکمل کہلاتی ہے۔ عموماً غزل میں پانچ، سات، نو، گیارہ، تیرہ، پندرہ، سترہ، انیس اور اکیس اشعار تک ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ اشعار پر مبنی بھی شعرانے کئی غزلیں کہی ہیں۔ غزل کی سب سے بڑی خوبی اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ یعنی کم الفاظ میں شاعر بہت کچھ بیان کر دیتا ہے۔ اور یہی امر غزل کو مقبولیت کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اردو میں غزل گوئی کی ابتدا حضرت امیر خسروؒ سے ہوتی ہے۔ دکنی ہندوستان میں بھی قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، نصرتی وغیرہ نے غزلیں کہی تھیں۔ لیکن یہ دور مثنوی کا دور تھا۔ پھر بھی اس دور میں صنفِ غزل کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اس دور کے غزل کے سب سے بڑے شاعر محمد قلی قطب شاہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے بعد اردو غزل کو باقاعدہ ایک مستند اور عوام میں قابل قبول صنف کی حیثیت عطا کروانے میں ولی دکنی کا کردار اہم ہے۔ ولی نے شمالی ہند (دہلی) آ کر اردو غزل کو نیا لہجہ اور آہنگ عطا کیا۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں اردو غزل کا عروج شروع ہوا۔ اس دور میں اردو کے تین باکمال شاعر پیدا ہوئے۔ مرزا محمد رفیع سودا (۱۷۸۱-۱۷۱۳ء)، میر تقی میر (۱۸۱۰-۱۷۲۲ء) اور خواجہ میر درد

(۱۷۸۵-۱۷۱۹ء) نے اردو غزل کو معراج عطا کی۔ اسی دور میں خان آرزو، شاہ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں جیسے شعرا بھی دنیاے ادب میں نمودار ہوئے۔ انھوں نے اردو غزل کو ایہام گوئی اور لفظی صنایعوں سے پاک کیا۔ میر، سودا اور درد نے اردو غزل میں حسن و عشق کی واردات کے ساتھ ہی اخلاق و تصوف کے مضامین بھی شامل کیے۔

سودا نے غزل میں تخیل کی بلندی، قصیدہ جیسا طمطراق اور زور بیان پیدا کیا تو درد نے اس صنف میں صوفیانہ خیالات نظم کیے۔ وہیں میر تقی میر نے اس صنف میں سوز و گداز، آہ و فغاں، درد و کسک کے جذبات ادا کر کے اس صنف کو آفاقیت بخشی اور ساتھ ہی سادگی، شیرینی، اثر آفرینی اور داخلی کیفیات کی ادائیگی سے غزل کو ہر دل عزیز بنا دیا۔ اردو غزل کے لیے یہ دور سنہری دور ثابت ہوا۔ میر نے اس صنف کو وہ عروج بخشا کہ بقول پروفیسر ڈاکٹر فضل امام ”اردو غزل کا دوسرا نام میر تقی میر ہے۔“ چنانچہ یہ کہنا کہ اردو غزل اپنی مقبولیت اور آفاقیت کے لیے ہمیشہ میر تقی میر کی مرہون منت رہے گی۔ بالکل صحیح و درست ہوگا۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں شمالی ہند میں مصحفی، جرات، انشا اور رنکین جیسے شعرا نے اس صنف کی تابناکی برقرار رکھی۔ اس دور میں ان شعرا نے اردو غزل میں تصنع، آورد اور معاملہ بندی جیسے خیالات کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ حالانکہ یہ غزل کے معیار و تقدس کے اعتبار سے مضرت ثابت ہوئے۔ لیکن پھر بھی اردو غزل میں نئے خیالات و افکار نے اپنی جگہ بنائی۔ لکھنؤ کے عیش پرور ماحول میں رہ کر ان شعرا نے غزل میں تصنع، آورد اور معاملہ بندی کے ساتھ ہی عریانی اور ابتذال کو بھی شامل کر لیا۔ لہذا غزل میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک اور اختلاط کی باتوں کا کھلے طور پر ذکر ہونے لگا۔ اسی دور میں اس کے اثر سے رنجت، کی ایجاد ہوئی۔ رنجت ایسی شاعری کہلاتی ہے جس میں عورتوں کی باتیں عورتوں کی زبان میں نظم کرتے تھے۔ اس سے اردو غزل میں عریانیت اور ابتذال کی شمولیت ہوئی۔

اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی شروعات میں اردو غزل کے افق پر شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی، خواجہ حیدر علی آتش، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مرزا غالب اور حکیم مومن خاں مومن جیسے شہرہ آفاق شاعر نمودار ہوئے۔ آتش اور ناسخ نے لکھنوی رنگ میں رہتے ہوئے غزل میں رنگینی، معاملہ بندی اور آورد کے ساتھ ہی نازک خیالی، معاملاتِ حسن و عشق اور تصوف کے جذبات سموئے تو دہلی میں ذوق دہلوی نے غزل گوئی میں اپنی استادی اور قادر الکلامی ثابت کی۔ مومن نے غزل میں معاملاتِ عشق کا بیان کر محبوب کے حسن و جمال کو غزل کا موضوع بنایا اور غزل میں تغزل پیدا کیا۔ وہیں مرزا غالب نے غزل میں نئے خیالات اور نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا۔ غالب نے غزل میں روایات پارینہ سے ہٹ کر تخیل، فکر، فلسفہ و حکمت کے ساتھ ہی نیا انداز بیان رائج کر کے غزل کو ایک نئی راہ بخشی۔ یہ دور اردو غزل کا زریں دور کہلاتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں داغ دہلوی، امیر بینا، جلیل مانک پوری، تسلیم لکھنوی، آرزو لکھنوی، حسرت موہانی، فانی بدایونی جیسے باکمال شعرا اور پھر بیسویں صدی میں جگر مراد آبادی، عزیز لکھنوی، اصغر گونڈوی، شاد عظیم آبادی، فراق گورکھپوری، اسرار الحق مجاز لکھنوی، فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، معین احسن جذبی، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، اختر انصاری، جاں نثار اختر، ناصر کاظمی اور ساآر لدھیانوی جیسے شعرا نے غزل کی مقبولیت میں چار چاند لگائے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب

اسد اللہ خاں نام پہلے اسد اور بعد میں غالب تخلص اختیار کیا۔ نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ خطابات سے نوازے گئے۔ مرزا نوشہ عرفیت تھی۔ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا مرزا قوقان بیگ شاہ عالم، بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے اور دربار میں عزت پائی۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ مختلف ریاستوں میں مامور رہے بعد میں کسی لڑائی میں ہلاک ہوئے۔

والد کی وفات کے بعد مرزا کی تعلیم و تربیت ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے کی جو انگریز فوج میں رسالدار تھے۔ مرزا نے ابتدائی تعلیم شیخ معظم سے حاصل کی۔ مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں نواب الہی بخش خاں کی بیٹی امراؤ بیگم سے دہلی میں ہوئی اس کے بعد مرزا نے مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ چچا کے انتقال کے بعد ایک جاگیر کے عوض سات سو روپیہ سالانہ بطور پنشن غالب کو ملتی رہی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں مرزا کو بڑی تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا۔ کئی مہینوں تک گھر میں مقید رہے۔ مغل دربار سے وابستگی کے سبب ان کی پنشن روک دی گئی بعد میں بڑی کوششوں سے پنشن بحال ہوئی۔ غرض مرزا اپنی فیاضی اور فراخ دلی کے سبب ہمیشہ پریشان حال رہے۔

مرزا کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ پہلے فارسی بعد میں اردو میں شاعری کرنے لگے۔ مرزا اپنی غیر معمولی ذہانت اور جدت پسند طبیعت کے سبب بہت جلد کامل اساتذہ میں شمار ہونے لگے۔ ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے انہیں اپنا استاد مقرر کیا۔ اس طرح انہیں درباری سرپرستی حاصل ہوئی۔ آخر ۲۷ سال کی عمر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں رحلت پائی اور درگاہ حضرت نظام الدین کے احاطہ میں دفن کئے گئے۔

غالب ایک ذہین اور صاحب فکر انسان تھے انہوں نے اردو غزل کو اپنے اچھوتے اندازِ بیان سے مالا مال کیا۔ مرزا نے غزل میں نئے نئے تجربے کیے۔ فکر کی گہرائی اور گیرائی اور نادر خیالات سے اردو شاعری میں آفاقیت پیدا کی۔ غالب نے اپنے کلام میں حسن و عشق کے جذبات اور احساسات کو بڑے حکیمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ خیالات کی بلندی، فکر و تخیل کی ندرت اور جدت پسندی کے ساتھ کلام میں شوخی و ظرافت کا عنصر بھی بہت نمایاں ہے۔

غالب کو فارسی زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اس لیے ان کے اردو کلام میں فارسی تراکیب کا استعمال کثرت سے ملتا ہے لیکن غالب نے فارسی تراکیب اور سہل الفاظ میں لطیف جذبات اور احساسات کی ترجمانی اس انداز میں کی ہے کہ ان میں انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ غالب کے ابتدائی کلام میں ثقیل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ مگر بعد میں غالب کو احساس ہو تو انہوں نے سہل نگاری کی طرف اپنی توجہ کی اور کلام میں خوش نما تراکیب اور سہل الفاظ کے استعمال سے عام فہم بنانے کی کوشش کی۔

غالب کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے غزل میں عام روش سے ہٹ کر موضوعات اور مضامین کا انتخاب کیا۔ انہوں نے ساری زندگی مشاہدات اور تجربات کیے۔ غزل کو حسن و عشق کے محدود دائرے سے نکال کر اس میں حکیمانہ افکار اور متصوفانہ خیالات کے ذریعہ اس میں دسعت اور تنوع پیدا کیا۔ غالب نے ہر زمانے اور ہر دور کی تمکین کا سامان مہیا کر لیا۔ بات میں بات نکالنے کا ہنر ہمیں جو غالب کے یہاں جس تاثیر کے ساتھ ملتا ہے وہ شاید ہی کہیں ملے گا۔ وہ اپنی بات کو اختصار کے ساتھ کہنے کے قائل ہیں۔ ان کے کلام میں معنویت اور جامعیت قابل دید ہے۔ وہ پرانے اور فرسودہ مضامین کو اپنے اندازِ فکر اور تخیل کی بلندی سے اچھوتا اور نادر بنا دیتے ہیں۔

غالب نہ صرف ایک باکمال شاعر تھے بلکہ خوش فکر نثر بھی تھے انہوں نے اردو و فارسی دونوں

زبانوں میں اپنی بے مثال نثری کارنامے انجام دئے ہیں۔ غالب کے دوستوں کا ایک وسیع دائرہ تھا۔ جن سے وہ ہر وقت خط و کتابت کر کے اپنا دل بہلاتے تھے اور شاعری کے علاوہ ان کے گزر اوقات کا ذریعہ بھی تھا۔ غالب نے دوستوں کو جو خطوط لکھے وہ اُردو میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں انہوں نے ایک طرزِ خاص کی ایجاد کی۔ انہوں نے خطوط میں مروجہ القاب و آداب کو ترک کیا۔ بے محل اور بے موقع گفتگو سے پرہیز کیا۔ زبان بے تکلف سادہ اور پر لطف استعمال کی۔ انداز ایسا گویا دو شخص آ منے سامنے بیٹھ کر گفتگو کر رہے ہوں۔ بعد میں غالب کے لکھے ہوئے یہ خطوط مختلف مجموعوں کی شکل میں شائع ہوئے۔ ”اُردوئے معلیٰ“، ”عودِ ہندی“ اور ”خطوطِ غالب“ ان کے خطوط کے مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ غالب کی دیگر تصانیف میں دیوانِ غالب، کلیاتِ نظمِ فارسی، مثنویِ شانِ نبوت و ولادت، چراغِ دیر، دستنبو، قاطعِ برہان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

غالب کی شخصیت اُردو شعر و ادب کے لیے گراں مایہ سرمایہ ہے۔ ایسا سرمایہ جس کی چمک رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

غزل

(۱)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
ترے وعدے پر جیسے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا
کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرنیم کش کو
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
غم اگر چہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غمِ بری بلا ہے
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
اسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا؟

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کہ خوشی سے مرنہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
غمِ عشقِ گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
جو دوئی کی بوبھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف! یہ تیرا بیان غالب

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غزل

(۲)

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خونِ خلق
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
گر نی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر

جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
ہم کو حریمِ لذتِ آزار دیکھ کر
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہِ ظرفِ قدحِ خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

غزل (۱)

معانی	الفاظ
دوست سے ملاقات	وصال یار
آدھا کھچا ہوا	نیم کش
چھین، اضطراب	خلش
نصیحت کرنے والا	ناصح
علاج کرنے والا، معالج	چارہ ساز
ہمدرد، غمخوار	غم گسار
جان کو گھٹانے والا، عمر کم کرنے والا	جان گسل
زمانے کا غم، دنیا کا درد	غم روزگار
شرابی	بادہ خوار

غزل (۲)

دوست (محبوب) کے چہرے کی تجلی (چمک)	تابِ رخ یار
آگ کو پوجنے والا، پارسی مذہب کا پیروکار	آتش پرست
دنیا دار۔ عام انسان	اہل جہاں

شعلے برسانے والا	شرر بار
صراحی، شراب کی بوتل	مینا
ہائے افسوس	وا حسرتا
لاچی	حریص
کانٹوں سے بھرا ہوا۔	پر خار
شراب	بادہ
برتن، پیالہ	ظرف
شرابی	قدح خوار
پریشان حال	شوریدہ حال

مشقی سوالات

مختصر سوالات:

- ۱۔ مرزا غالب کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
- ۲۔ غالب کی عرفیت کیا تھی؟
- ۳۔ شاعر کا جی کیا دیکھ کر خوش ہوا؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
مرزا غالب نے مذکورہ شعر میں کیا بات بیان کی ہے؟
- ۵۔ گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر
غالب کے مندرجہ بالا شعر کا مطلب لکھئے۔
- ۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی بتائیے۔
وصال یار۔ نیم کش۔ ناصح۔ آتش پرست۔

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ مرزا غالب کے حالات زندگی پر روشنی ڈالنے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں کو بیان کیجئے۔
- ۸۔ مرزا غالب کی پہلی غزل کے شعر نمبر ۲، ۳، ۴، ۸ اور دوسری غزل کے شعر نمبر ۴، ۶ اور ۸ کے
مطلب لکھئے۔

مومن خاں مومن

مومن خاں نام مومن ہی تخلص تھا۔ حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں بہمقام دہلی پیدا ہوئے۔ حکمت ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ آپ کے دادا طبیب کی حیثیت سے شاہی دربار میں ملازم تھے۔ شاہی خدمت کے صلے میں انھیں چند مواضع جاگیر میں ملے تھے۔ بعد میں انگریزی سرکار نے جاگیر کے عوض میں پنشن مقرر کر دی تھی۔ مومن کو بھی وراثت میں یہ پنشن ملتی رہی۔

مومن کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ شاہ عبدالقادر سے عربی کا درس لیا، طب کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ مومن کو ریاضی، علم نجوم اور رمل وغیرہ میں مہارت تھی شطرنج کے بھی ماہر تھے۔ خوشحال گھرانے سے تعلق کے سبب معاشی فکرات سے آزاد رہے۔ مومن بڑے خوش طبع، زندہ دل، یار باش اور آزاد مشرب انسان تھے۔ شاعری میں شاہ نصیر سے مشورہ بخن کرتے تھے۔

مومن نے اس دور میں آنکھ کھولی جب سودا، میر، درد اور سوز جیسے کامل الفن اساتذہ کی شاعری کے چرچے ہو رہے تھے۔ ایسی پر کیف فضا میں مومن کی شاعری پروان چڑھی۔ مومن نے اردو غزل کو اس کے حقیقی معنی میں استعمال کیا اور اس میں ایک اچھوتے پن کا احساس کرایا۔ حالاں کہ ان کی غزل حسن و عشق کے محدود دائرے میں رہی مگر انہوں نے اپنی فکر انگیزی سے اس میں جدتیں پیدا کیں اور معاملاتِ حسن و عشق کو اس طرح پیش کیا کہ ہر جگہ نئی کیفیت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

مومن کی غزلوں میں نازک خیالی، اسلوب کی جدت، سادگی، روانی، برجستگی اور جذبات کی شدت سبھی کچھ موجود ہے۔ مومن اپنی طبیعت کی رنگینی کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہر جگہ حسن و عشق، نزاکت، لطافت اور رنگین بیانی نظر آتی ہے۔ مومن کی غزلوں میں اثر آفرینی اور جذبات

کی صداقت کے ساتھ وارداتِ حقیقی کا بیان نمایاں ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑے مؤثر مضامین باندھتے ہیں۔ انھوں نے مقطع میں اکثر تخلص کو بڑی رعایت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

یہ بات بھی بہت مشہور ہے کہ ایک مشاعرے میں جب مومن نے یہ شعر پڑھا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو یہ شعر مرزا غالب کو اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے اس شعر کے عوض میں اپنا پورا دیوان دینے کی پیش کش کی۔

مومن کے کلام میں اسلوب کی جدت، پیچیدگی اور سادگی کے متضاد عناصر بھی شامل ہیں۔ نازک

خیالی اور طرز ادا کا لطیف پیرایہ ان کی غزلوں میں نرالی شان پیدا کرتے ہیں۔ مومن نے حسن و عشق کے

بندھے ٹکے مضامین میں وہ تنوع پیدا کیا کہ اس میں جاذبیت کا حسن منفرد انداز لیے ہوئے نظر آتا ہے۔

انھوں نے اپنی بات کو غیر معروف پیرایہ میں کہنے کو فوجیت دی۔ وہ اپنی بات فلسفیانہ اور حکمت آمیزی کے

ساتھ کہنے کے قائل نہیں اور نہ ہی ان کی شاعری میں اخلاقی قدروں کی پیش رفت ہے مگر ان کی شاعری

قدیم انداز بیان کے ساتھ ذہنوں میں ایک نئی ترنگ اور نغمگی پیدا کرتی ہے۔ وہ عشقِ مجازی کے غماز اور

حسن لامتناہی کے پرستار ہیں اور ان کی تمام تر شاعری کا دار و مدار اسی پر موقوف ہے۔ مومن کی چند

مثنویاں اور قصائد بھی ہیں لیکن ان کی پوری توجہ غزلوں پر ہی مرکوز رہی۔

مومن اپنے منفرد اور مخصوص شعری مزاج کے سبب اردو شاعری میں ایک الگ پہچان رکھتے

ہیں۔ وہ اپنے عہد کے بڑے مشہور اور مقبول شاعر تھے۔ ان کے شاگردوں میں نواب غلام مصطفیٰ خاں

شیفتہ، تسکین، وحشت اور نسیم جیسے قادر الکلام شاعر شامل ہیں۔

مومن علم نجوم اور تاریخ گوئی میں بڑے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی تاریخ و فوات خود نکالی تھی جو سچ

ثابت ہوئی یعنی دست و بازو بشکست (۱۲۵۸ء)

مطابق ۱۸۵۱ء میں انھوں نے اسی شکستہ حالی میں وفات پائی۔

حکیم مومن خاں مومن

غزل

(۱)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا رنجِ راحت فزا نہیں ہوتا
ذکرِ اغیار سے ہوا معلوم حرفِ ناصح برا نہیں ہوتا
اس نے کیا جانے! کیا کیا لے کر دل، کسی کام کا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر ہاتھ، دل سے، جدا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سُنے عرضِ مضطر، اے مومن

صنم، آخر حُدا نہیں ہوتا

حکیم مومن خاں مومن

غزل

(۲)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی سے کسی کو ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم
ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم
اس کو میں جا میریں گے، مدد اے ہجومِ عشق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم
لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

غزل (۱)

معانی	الفاظ
خوشی دینے والا	راحت فزا
غیر کی جمع، اجنبی لوگ، دشمن	اغیار
نصیحت کرنے والا	ناصح
پریشان، بے چین	مضطرب
بت، معشوق	صنم

غزل (۲)

مجبور، بے بس	ناچار
لا چاری، عاجزی، مجبوری	بے کسی
کوچہ، گلی	گُو
میل جول، تعلق	ربط

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ مومن کا پورا نام بتائیے۔
- ۲۔ مومن کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
- ۳۔ شاعر نے دل میں کیا ٹھانی تھی؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
- مومن کے مذکورہ شعر کا مطلب لکھیے۔
- ۵۔ ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی سے کسی کو ہم منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم
- مومن کے اس شعر کی وضاحت کیجیے۔
- ۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی بتائیے۔
- اغیار۔ ناصح۔ مضطر۔ ناچار۔ ربط۔ بدعتی۔

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ حکیم مومن خاں مومن کے حالات زندگی تحریر کیجیے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں پر روشنی بھی ڈالیے
- ۸۔ مومن کی پہلی غزل کے شعر نمبر ۱، ۲، ۳ اور دوسری غزل کے شعر نمبر ۱، ۲ اور ۳ کے مطلب لکھیے۔

نواب مرزا خاں داغ

نواب مرزا داغ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ نواب شمس الدین خاں فیروز پور جھر کہ کے فرزند تھے۔ داغ جب سات برس کے تھے تو ان کے والد غدر کے ہنگامے میں انگریزوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔ داغ کی والدہ وزیر بیگم کا دوسرا نکاح ۱۸۴۲ء میں ولی عہد سلطنت غلام فخر الدین سے ہوا جو بہادر شاہ ظفر کے بیٹے تھے۔

اس وقت داغ کی عمر ۱۳ برس تھی۔ داغ بچپن سے بڑے ذہین اور ہونہار تھے۔ لہذا انھیں خاقانی ہند استاد ذوق کے سپرد کر دیا گیا۔ قریب دس سال داغ نے ذوق سے فیض اٹھایا۔ اس دوران وہ غالب سے بھی ملتے رہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ غالب سے داغ کے متعلق دریافت کیا گیا تو غالب نے کہا۔ ”داغ کی اردو ایسی عمدہ ہے کہ کیا کسی کی ہوگی۔ ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا داغ نہ صرف اس کو پال رہا ہے بلکہ تعلیم دے رہا ہے۔“

۱۸۵۶ء میں مرزا فخر الدین کے انتقال کے بعد داغ راہپور چلے آئے۔ وہاں نواب یوسف علی خاں ناظم نے ان کی بڑی قدر دانی کی اور جب تک زندہ رہے داغ کی سرپرستی کرتے رہے۔ اس کے بعد ان کے ولی عہد نواب کلب علی خاں نے داغ کو بڑی عزت بخشی اور انھیں فراش خانے اور اصطلبل کا داروغہ بنایا۔ داغ نے انھیں کے ساتھ فریضہ حج بھی ادا کیا۔ تقریباً تیس سال دربار سے وابستگی کے بعد حیدرآباد کا رخ کیا۔ رام پور میں قیام کے دوران مظفر علی اسیر، امیر مینائی، سید ضامن علی جلال اور اسماعیل حسین منیر جیسے باکمال اساتذہ سے صحبت رہی مگر داغ کی مقبولیت ان سب سے زیادہ تھی۔

حیدرآباد میں وہاں کے نواب محبوب علی خاں نے داغ کو اپنا مشیر سخن (استاد) مقرر کیا اور چار سو

روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی بعد میں اس میں اضافہ ہوا اور تنخواہ سترہ سو روپیہ تک پہنچ گئی تھی۔ یہ اتنی بڑی تنخواہ تھی جو اس زمانے میں کسی شاعر کو میسر نہ تھی۔ اس کے علاوہ نظام حیدرآباد نے انھیں ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ اور فصیح الملک کے خطابات کے ساتھ جاگیر بھی عطا کی۔ حیدرآباد میں آ کر داغ نے بڑے عیش و نشاط کی زندگی بسر کی اور یہیں ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو فالج کے اثر کے بعد انتقال کیا۔

داغ اردو شاعری کے بے حد کامیاب اور مقبول شاعر تھے۔ ان کی شہرت ملک کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ شاگردوں کی تعداد کے پیش نظر انھوں نے ایک دفتر کھول رکھا تھا جس میں ان کا رجسٹریشن (اندرج) کیا جاتا تھا۔ داغ کے مشہور تلامذہ میں محبوب علی خاں آصف، وحید الدین بیجو دہلوی، علامہ اقبال، ناطق گلاوٹھی، محمد علی جوہر، جگر مراد آبادی، آغا شاعر قزلباش، سائل دہلوی، سیماب اکبر آبادی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

داغ ایک پُرگو شاعر تھے ان کو زبان و بیان پر کامل قدرت حاصل تھی۔ داغ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی اصلاح کی اور اس میں حسن و نکھار پیدا کیا۔ داغ اپنے ہم عصروں میں بڑے مشہور تھے۔ داغ کی شاعری عشق مجازی پر محمول ہے۔ وہ حسن و عشق کے معاملات کو بڑی بے باکی سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ، محبوب کی اداؤں پر فریفتہ ہونا، شوخی، چلبلا پن اور بعض جگہ عامیانه پن وابتدال سے بھی کام لیتے ہیں۔ داغ کی زبان دہلی کی ٹکسالی، بامحاورہ، سادہ، اور سلیس زبان ہے۔ زبان کا چٹخارہ اس میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔ شاید ہی ان کا کوئی شعر لطفِ زبان سے خالی ہو۔ سطحی عشقیہ جذبات اور احساسات ہی ان کی شاعری کی جان ہیں۔ معاملہ بندی، رنگینی اور شوخی لطفِ زبان انکی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ داغ کی غزلوں میں نسوانی جذبات کی عکاسی بھی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ داغ کی شاعری میں ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں وہی پیش کیا ہے جو وہ اپنے ارد گرد محسوس کر رہے تھے۔ اس میں بناوٹ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری

کی دھوم سارے ہندوستان میں تھی ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔ ے
اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے
داغ کی وفات پر ان کے شاگرد علامہ اقبال نے اپنے مہربان استاد کی یاد میں ایک مرثیہ بعنوان
”مرثیہ داغ“ لکھا، جو بہت مقبول اور مشہور ہوا۔ اس مرثیے کا ایک شعر دیکھیے۔ ے
اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاکِ دلی، داغ کو روتا ہوں میں
داغ کی وفات کے بعد ان کے رنگ کو آگے بڑھانے والوں میں نوح، سائل اور بے خود دہلوی
وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
نواب مرزا داغ کی تصانیف میں چار دیوان ”گلزارِ داغ“، ”آفتابِ داغ“، ”مہتابِ داغ“
اور ”یادگارِ داغ“ ہیں اس کے علاوہ ایک مثنوی ”فریادِ داغ“ ہے۔ انھوں نے چند قصائد اور دہلی کے
حالات پر ایک شہر آشوب بھی نظم کیا ہے۔

غزل

(۱)

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
کرتے ہیں قتل وہ طلبِ مغفرت کے بعد جو تھے دعا کے ہاتھ وہی امتحاں کے ہیں
جس دن سے کچھ شریک ہوئی میری مشیتِ خاک اس روز سے زمیں پہ ستم آسماں کے ہیں
کیا جواب؟ حضرتِ دل! دیکھیے ذرا پیغامِ بر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں
کیا اضطرابِ شوق نے مجھ کو ججل کیا
وہ پوچھتے ہیں کہیے ارادے کہاں کے ہیں

غزل

(۲)

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا
میری وفانے مجھے خوب شرمسار کیا
بُرا ہودل کا بُرے وقت ہوشیار کیا
کچھ آپ نے میرے کہنے کا اعتبار کیا
کچھ آگے داوڑ محشر سے ہے اُمید مجھے
کسی کے عشق نہا میں یہ بدگمانی تھی
کہ ڈرتے ڈرتے خُدا پر بھی آشکار کیا
وہ بات کر جو کبھی آسماں سے ہونہ سکے
ستم کیا تو بڑا تُو نے افتخار کیا

بنے گا مہرِ قیامت بھی ایک خالِ سیاہ

جو چہرہ داغِ سیاہ رونے آشکار کیا

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

غزل (۱)

معانی	الفاظ
شرمندہ، نادم	شرمسار
قیامت کے دن انصاف کرنے والا اللہ تعالیٰ	داورِ محشر
فخر، عزت	افتخار
قیامت کی مہر (چھاپ)	مہر قیامت
کالاتل	خال سیاہ
شرمندہ، گنہگار	سیہ رو

غزل (۲)

ظاہر واضح	آشکار
دُنیا	کون و مکاں
بخشش (نجات) کی خواہش	طلب مغفرت
مٹھی بھر خاک، بمعنی انسان	مشت خاک
بے چینی، بے قراری	اضطراب
شرمندہ، شرمسار	نجل

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- (۱) داغ دہلوی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
- (۲) داغ کے کسی ایک دیوان کا نام لکھیے۔
- (۳) مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی بتائیے۔
داور محشر۔ خال سیاہ۔ کون و مکاں۔ نجل۔

مختصر سوالات:

- (۴) 'قیامت کا انتظار سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
- (۵) مندرجہ ذیل شعر کا مطلب لکھئے۔
جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
- (۶) داغ دہلوی کے دو اشعار (اپنی پسند سے) لکھئے۔

تفصیلی سوالات:

- (۷) داغ دہلوی کے حالات زندگی مختصراً تحریر کرتے ہوئے ان کی غزل گوئی پر تبصرہ کیجئے۔
- (۸) داغ دہلوی کی شامل نصاب پہلی غزل کے مطلع اور مقطع نیز دوسری غزل کے شعر نمبر ۲، ۳ اور ۴ کے مطلب لکھئے۔

جگر مراد آبادی

علی سکندر نام اور جگر تخلص تھا۔ ۱۸۹۳ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی نظر علی نظر ایک صاحب دیوان شاعر تھے اور خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے گویا جگر کو شاعری وراثت میں ملی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ سات برس کی عمر میں والد کے ساتھ مراد آباد چلے آئے۔ نوعمری سے شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ ابتدا میں والد سے اصلاح لی پھر داغ دہلوی اور امیر اللہ تسلیم سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ مشن اسکول لکھنوی میں زیر تعلیم تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا تو نویں جماعت میں فیصل ہو گئے اور انہوں نے تعلیم بھی ترک کر دی۔ جگر کے چچا نے انہیں میونسپلٹی میں ملازمت دلوائی۔ کچھ عرصہ بعد آگرہ پہنچ کر انہوں نے شادی کی بعد میں والدہ اور بیوی کو ساتھ لے کر مراد آباد چلے آئے۔ وہاں انہوں نے چشموں کا کاروبار شروع کیا۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ فیض آباد، اعظم گڑھ، گونڈہ و دیگر شہروں میں بھی آتے جاتے رہے۔ شراب نوشی کے سبب ہمیشہ سرگرداں حال رہے۔

بعد میں اصغر گونڈوی کے سمجھانے پر انہوں نے شراب نوشی سے توبہ کی اور ۱۹۵۳ء میں فریضہ حج بھی ادا کیا۔ جگر نے اپنی زندگی کے آخری دور میں تصوف و حکیمانہ فکر کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ ان کی شعری وراثت میں تین مجموعہ کلام ”داغِ جگر“، ”شعلہ طور“ اور ”آتشِ گل“، یادگار ہیں۔ آخری مجموعہ پر انہیں ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا تھا۔ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی تھی۔

جگر نے ایک عرصہ تک علیل رہنے کے بعد گونڈہ میں ۱۹۶۰ء میں وفات پائی۔ جگر اپنے عہد کے بڑے مقبول شاعر تھے۔ وہ اپنے مخصوص ترنم اور نغمگی کے سبب مشاعروں میں چھا جاتے تھے۔ جگر کا

یہ رنگ ایسا مقبول ہوا کہ ہر ایک ان کی تقلید کرتا نظر آتا تھا۔ جگر کی غزلوں میں سرمستی، سرشاری اور والہانہ پن دیکھتے ہی بنتا ہے۔ زبان کے لحاظ سے وہ سادگی، روانی اور برجستگی کے قائل ہیں وہ مشکل الفاظ اور بھاری بھر کم فارسی تراکیب سے گریز کرتے ہیں۔ یہی چیزیں ان کے کلام کو زیادہ تاثیر بخشتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں ہم عصر زندگی کی کشمکش اور انسانی مسائل سے آگہی کے ساتھ جذبات اور احساسات کا برملا اظہار بھی موجود ہے۔

جگر کی شاعری کا اصل رنگ ”شعلہ طور“ میں ظاہر ہوتا ہے۔ شعلہ طور کی غزلوں میں غضب کی دلکشی، مستی اور والہانہ پن موجود ہے۔ کلام میں ایسی کشش اور وارفتگی ہے کہ پڑھنے اور سننے والے پر سحر طاری کر دیتی ہیں۔ شعلہ طور کا یہ شعر بطور خاص ملاحظہ کیجیے۔

دل گیا رونقِ حیات گئی غم گیا ساری کائنات گئی

اس طرح جگر کا آخری مجموعہ ”آتش گل“ بھی مرصع اور حسین ترین غزلوں سے معمور ہے۔ اس مجموعہ کلام میں حسن و عشق کے موضوعات کو بڑی خوبصورتی اور دل نشینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جگر نے اپنی غزلوں میں ہم عصر زندگی کی کشمکش اور دیگر انسانی مسائل کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کے آخری دور کے کلام میں فلسفیانہ، صوفیانہ اور اخلاقی ہر طرح کے موضوعات کا اظہار ملتا ہے۔ جگر کے کلام میں کہیں کہیں تقسیم وطن کے حالات کا کرب بھی نظر آتا ہے۔

جگر نے زبان کے معاملے میں قدیم اساتذہ کی تقلید کی لیکن فارسی الفاظ اور تراکیب سے بچنے کی بھی کوشش کی ہے۔ سہل لب و لہجہ اور شیریں الفاظ ان کے کلام کو مزید دلکشی بخشتے ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں دلکش اور روانی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ کلام کی یہی خصوصیات ان کی مقبولیت کا سبب ہیں۔

غزل

(۱)

دل کو سکون، روح کو آرام آ گیا موت آگئی کہ دوست کا پیغام آ گیا
جب کوئی ذکرِ گردشِ ایام آ گیا بے اختیار لب پہ ترا نام آ گیا
غم میں بھی سرور وہ ہنگام آ گیا شاید کہ دورِ بادۂ کلفام آ گیا
دیوانگی ہو عقل ہو امید ہو کہ یاس اپنا وہی ہے وقت پہ جو کام آ گیا
صیاد شادماں ہے مگر یہ تو سوچ لے میں آ گیا کہ سایہ تہِ دام آ گیا
یہ کیا مقامِ عشق ہے ظالم کہ ان دنوں اکثر ترے بغیر بھی آرام آ گیا
احباب مجھ سے قطع تعلق کریں جگر
اب آفتابِ زیست لبِ بام آ گیا

غزل

(۲)

برابر سے بچ کر گزر جانے والے
نہیں جانتے کچھ کہ جانا کہاں ہے
مرے دل کی بے تابیاں بھی لیے جا
ترے اک اشارے پہ ساکت کھڑے ہیں
یہ نالے نہیں بے اثر جانے والے
چلے جا رہے ہیں مگر جانے والے
دبے پاؤں منہ پھیر کر جانے والے
”نہیں“ کہہ کہ سب سے گذر جانے والے

محبت میں ہم تو جیسے ہیں، جنیں گے

وہ ہوں گے کوئی اور مر جانے والے

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

غزل نمبر ۱

معانی	الفاظ
مصیبت کے دن، بُرے دن	گردشِ ایام
خوشی، انبساط، ہلکانشہ	سُرور
سرخ شراب	بادہٴ گلغام
ناامیدی، مایوسی	یاس
زندگی	زیست

غزل نمبر ۲

معانی	الفاظ
فریاد، شور و فغاں	نالے
بے حرکت، خاموش	ساکت
چپ چاپ	دبے پاؤں

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- (۱) جگر مراد آبادی کا پورا نام بتائیے۔
- (۲) جگر کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
- (۳) جگر کے مطابق دل کو سکون اور روح کو آرام کیسے آیا؟

مختصر سوالات:

- (۴) جگر مراد آبادی کی تخلیقات کے نام بتائیے۔
- (۵) مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی بتائیے۔
گردش ایام - بادہ گلغام - زیست - نالے
- (۶) مندرجہ ذیل شعر کا مطلب لکھیے۔
نہیں جانتے کہ جانا کہاں ہے
چلے جا رہے ہیں مگر جانے والے

تفصیلی سوالات:

- (۷) جگر مراد آبادی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالنے اور ان کی غزل گوئی کی خوبیوں پر تبصرہ کیجیے۔
- (۸) نصاب میں شامل جگر کی غزل نمبر ۱ کے شعر نمبر ۲، ۳، ۴ اور غزل ۲ کے شعر نمبر ۱، ۲ اور ۵ کے مطلب لکھیے۔

فراق گورکھپوری

فراق کا اصلی نام رگھوپتی سہائے تھا۔ فراق تخلص۔ ۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت پیشہ سے وکیل اور بڑے خوش فکر شاعر تھے۔ فراق کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ بعد میں ایف۔ اے۔ کی تعلیم کے لیے الہ آباد چلے آئے۔ یہاں انھیں پروفیسر ناصر کی صحبت اور رہنمائی حاصل ہوئی۔ پروفیسر ناصر عربی و فارسی کے استاد تھے، جو شعر گوئی کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ فراق نے پہلے آپ سے مشورہ سُن کر کیا بعد میں وسیم خیر آبادی کو اپنا استاد بنایا۔

فراق نے ۱۹۱۸ء میں سول سروس کا امتحان پاس کیا اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے لیے منتخب ہوئے لیکن انہوں نے ملازمت نہیں کی اور تحریک آزادی میں شامل ہو گئے۔ اس سلسلے میں انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ جیل میں ان کا ساتھ مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی اور ابوالکلام آزاد جیسے باذوق اساتذہ سے رہا جن کی صحبت میں انھیں شعر گوئی کی ترغیب ملی۔

۱۹۲۷ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد پہلے کرسچین کالج لکھنؤ میں اور پھر ایس۔ ڈی۔ کالج کانپور میں اردو پڑھانے پر مامور ہوئے۔ اسی اثنا میں فراق نے انگریزی میں ایم۔ اے۔ کیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر ہو گئے اور وہیں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ حکومت ہند نے ان کی شعری خدمات پر ۱۹۷۶ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا۔ انھوں نے ۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

فراق اپنے دور کے بہت مشہور اور مقبول شاعر تھے۔ انہوں نے نظمیں اور رباعیات بھی کہی ہیں لیکن غزل ہی ان کی پہچان کا سبب بنی۔ ان کے ابتدائی کلام میں امیر مینائی اور عزیز و صفی کا رنگ ملتا ہے

اور کہیں کہیں میر کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ غم حیات اور غمِ جاناں سے لطف اندوز ہونے کا رجحان بھی کلام میں ظاہر ہوتا ہے۔ فراق کی شاعری میں حسن و عشق کی نفسیات اور جذبات کا اتار چڑھاؤ جا بجا ملتا ہے۔ فراق عشق کے روایتی تصور سے الگ ہٹ کر بات کہتے ہیں۔

فراق نے اکثر طویل غزلیں کہی ہیں۔ مطالعہ کی وسعت نے ان کے اندازِ بیان میں پختگی اور تخیل میں ندرت پیدا کر دی ہے۔ وہ بلاشبہ بیسویں صدی کے نامور اور مقبول ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں 'شعلہ ساز'، 'روح کائنات'، 'شبستان'، 'پچھلی رات'، 'روپ' اور 'گلِ نغمہ' وغیرہ یادگار ہیں۔

فراق کی مقبولیت کا سبب ان کی غزلیں ہیں جن میں حسن و عشق کے مختلف رنگ، جمالیاتی تاثیر کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں حسن و جمال کی بڑی دل کش اور جاندار تصویریں ملتی ہیں۔ ان کے یہاں حسن سے لطف اٹھانے کا تصور موجود ہے۔ عشق ان کے یہاں صرف جسمانی تسکین کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ روحانی احساسات اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ ان کے خیال میں بغیر اس جذبے کے کوئی عظیم شاعری جنم ہی نہیں لے سکتی۔ فراق نے اپنی شاعری میں قدیم روایتوں سے فائدہ اٹھایا ہے انھوں نے میر، غالب و مصحفی سے لے کر حسرت موہانی تک کے ہر بڑے شاعر کے کلام سے استفادہ کیا۔ البتہ انہوں نے اپنی شاعرانہ خوبیوں اور صلاحیتوں سے کام لے کر ان موضوعات میں نئی جان ڈال دی ہے۔

فراق نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں لیکن غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظمیں پھیلکی نظر آتی ہیں حالانکہ ان میں کچھ نظمیں تمام خصوصیات کی حامل ہیں انہوں نے اپنی نظموں میں عشقیہ، المیہ، سیاسی اور سوانحی ہر طرح کے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ فراق نے بعض رومانی نظمیں بھی کہی ہیں اور کچھ میں اپنے عہد کے حالات کا عکس نظر آتا ہے ان کی کامیاب نظموں میں 'جگنو'، 'ہاں اے دل افسردہ'،

’پر چھائیاں‘، ’شام عیادت‘، ’ہنڈولہ‘، ’فضا میں جیسے گلابی سی کوئی چھلکا دئے‘ وغیرہ کافی مشہور نظمیں ہیں۔
فراق نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان رباعیوں میں بھی انہوں نے
زور بیان کا مظاہرہ کیا ہے۔ فراق کا احساس جمال ان رباعیوں میں چھلکتا ہے۔ انہوں نے غزلوں میں
حسن و جمال کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہی کیفیت ان کی رباعیوں میں بھی نظر آتی ہے۔
مجموعی طور پر فراق بیسویں صدی کے بڑے قد آور اور منفرد حیثیت کے شاعر ہیں ان کی مقبولیت
اور کامیابی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں قدیم اور جدید قدروں کی پاسداری کی اور شاعری
میں ان موضوعات اور پہلوؤں کا انتخاب کیا۔ جن میں اپنے عہد کے جذبات اور احساسات کے ساتھ
عصری تقاضے بھی شامل تھے۔

غزل

(۱)

آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے اک شرح حیات ہو گئی ہے
جب دل کی وفات ہو گئی ہے ہر چیز کی رات ہو گئی ہے
غم سے چھٹ کر یہ غم ہے مجھ کو کیوں غم سے نجات ہو گئی ہے
مدّت سے خبر ملی نہ دل کی شاید کوئی بات ہو گئی ہے
جو چیز بھی مجھ کو ہاتھ آئی تیری سوغات ہو گئی ہے
اس دور میں زندگی بشر کی بیمار کی رات ہو گئی ہے
مٹنے لگیں زندگی کی قدریں جب غم سے نجات ہو گئی ہے

ایک ایک صفت فراق اُس کی

دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے

غزل

(۲)

ہر کائنات سے یہ الگ کائنات ہے
اب دورِ آسماں ہے، نہ دورِ حیات ہے
توڑا ہے لامکاں کی حدوں کو بھی عشق نے
ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا
یہ مؤشگافیاں ہیں گراں طبعِ عشق پر
حیرت سراے عشق میں دن ہے نہ رات ہے
اے دردِ ہجر! تو ہی بتا کتنی رات ہے
زندانِ عقل! تیری تو کیا کائنات ہے
یہ فرقِ مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے
کس کو دماغِ کاوشِ ذات و صفات ہے

عنوانِ غفلتوں کے ہیں، فرصت ہو یا وصال

بس فرصتِ حیاتِ فراق! ایک رات ہے

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

غزل (۱)

معانی	الفاظ
زندگی کی تفسیر، زندگی کی وضاحت	شرح حیات
تحفہ، ہدیہ	سوغات
قیمتیں، توقیر، اہمیت (قدر کی جمع)	قدریں
ہری بھری، ہریالی	برگِ نبات

غزل (۲)

معانی	الفاظ
دنیا، حقیقت	کائنات
جدائی کا درد	دردِ ہجر
دوسرا عالم، عالمِ قدس، خدا تعالیٰ	لامکاں
عقل مند، فلسفی، عقل کے اسیر	زندانی عقل
موت اور زندگی	مرگ و زیست
نکتہ چینی، چھان بین	مؤشگافیاں
وزنی، مشکل	گراں

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ فراق گورکھپوری کا پورا نام کیا تھا؟
- ۲۔ فراق کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟
- ۳۔ شاعر نے 'ہاتھ آئی چیز' کو کیا کہا ہے؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ فراق کے مندرجہ ذیل شعر کا مطلب بتائیے۔
اس دور میں زندگی بشر کی بیمار کی رات ہو گئی ہے
- ۵۔ فراق گورکھپوری کو کونسا اہم ایوارڈ دیا گیا تھا؟ اور کب دیا گیا؟
- ۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ میں سے سابقے اور لاحقے بتائیے۔
شرح حیات، مرگ نبات، زندان عقل، مرگ وزیست

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ فراق گورکھپوری کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں کو بھی بیان کیجیے۔
- ۸۔ شامل نصاب فراق کی پہلی غزل کے شعر نمبر ۳، ۷ اور ۸۔ اور دوسری غزل کے شعر نمبر ۱، ۳ اور ۴ کے مطلب لکھیے۔

ڈاکٹر معین الدین شاہین

قصیدہ: صنف اور مختصر تاریخ

قصیدہ عربی لفظ ہے جس کے معنی لغت نویسوں نے ”گاڑھا مغز“ ”مغز غلیظ“ ”او“ دلدار یا چربی دار گودا“ بتائے ہیں۔ بعض عالموں کا یہ بھی خیال ہے کہ قصیدہ لفظ ”قصد“ سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب ”ارادہ کرنا“ ہوتا ہے۔ اصطلاح شاعری میں قصیدہ اس شعری تخلیق کو کہتے ہیں جس کے تحت شاعر کسی شخص کی مدح (تعریف) یا مذمت (یعنی ہجو اور برائی) کرتا ہے۔

اردو و فارسی میں عام طور پر قصیدہ کا لفظ اس نظم کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں کسی مرثیہ یا بزرگ کی تعریف و توصیف بیان کی جاتی ہے۔ غزل کی طرح قصیدہ کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قصیدہ میں اشعار کی تعداد معین یا مقرر نہیں ہوتی۔ قصیدہ ہر بحر میں کہا جاسکتا ہے۔ قصیدہ میں بھی غزل کی طرح شاعر مقطع کا اہتمام کرتا ہے۔

قصیدہ کی دوا ہم قسمیں ہوتی ہیں، یعنی ”خطابیہ“ اور تمہیدیہ“ خطابیہ اس قصیدہ کو کہتے ہیں جس میں شاعر بغیر کسی تمہید کے اظہار مقصد کرتا ہے جبکہ تمہیدیہ قصیدہ اسے کہتے ہیں جس میں شاعر شروعات میں تمہید باندھتا ہے اور اس کے بعد مدعا بیان کرتا ہے۔ قصیدے میں پرشکوہ الفاظ اور بلند آہنگی کی اہمیت مسلم ہے۔ قصیدہ پانچ اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہوتا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ تشبیب:

اسے نسیب یا تمہید بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں حسن و عشق، فلسفہ و حکمت، شراب و شباب، موسم بہار کی منظر کشی، خود شناسی، پند و نصیحت اور دنیا کی بے ثباتی یا کوئی دلکش مضمون باندھا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ

تشبیہ کے موضوعات لامحدود ہیں۔

۲۔ گریز :

تشبیہ کے بعد شاعر مدح کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے گریز کے اشعار کہتا ہے۔ گریز تشبیہ اور مدح کو جوڑنے والی کڑی ہوتی ہے، جس سے ربط و تسلسل برقرار رہتا ہے۔

۳۔ مدح یا مذمت :

صنف قصیدہ کا یہ سب سے اہم اور اصل حصہ ہوتا ہے۔ مدح میں شاعر عموماً اپنے مدوح کی تعریف و ستائش کرتا ہے جس میں اس کے جاہ و جلال، شجاعت و سخاوت، علم و فضل اور عدل و انصاف وغیرہ کی تعریف ہوتی ہے۔ یہاں شاعر مبالغہ آمیز انداز بیان اختیار کرتا ہے۔ مرثیہ کی طرح یہاں بھی گھوڑے تلوار اور ہاتھیوں کی تعریف کی جاتی ہے۔ اگر کسی قصیدہ میں مذمت بیان کرنا مقصد ہو تو شاعر متعلقہ شخص کے عیب اور برائیوں کو ظاہر کرتا ہے۔

۴۔ حسن طلب، مدد عا یا عرض مطلب :

شاعر قصیدہ کو انجام یا احتتام تک پہنچانے سے قبل اکثر ایسے اشعار تخلیق کرتا ہے جن میں اپنے مدوح سے کسی طرح کی بخشش، اعزاز و اکرام یا صلے کی خواہش شامل ہوتی ہے۔

۵۔ دُعا :

یہ قصیدے کا آخری حصہ ہوتا ہے جس میں شاعر اپنے مدوح کے لیے صحت، سلامتی، درازی عمر اور خیر و عافیت کی دعا اور اس کے دشمنوں اور بدخواہوں کے لیے بددعا کرتا ہے۔

اردو میں قصیدہ نگاری کا آغاز خطہ دکن میں ہوا۔ سلاطین بہمنی میں مشتاق اور لطفی نامی شاعروں نے قصیدہ گوئی کو رواج دیا۔ گول کنڈہ کے سلطان اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ

مائی اور ان کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ ظلل اللہ کے علاوہ نصرتی، غواصی، ابن نشاطی، مقیمی، رستمی اور ولی جیسے باکمال شاعروں نے قصیدہ گوئی کی روایت کو آگے بڑھایا۔

لکھنؤ میں انشاء اور مصحفی نے قصیدہ نگاری کو بال و پر عطا کیے۔ مرزا محمد رفیع سودا قصیدہ نگاری کے آفتاب و ماہتاب تسلیم کیے جاتے ہیں۔ قصیدہ نگاری کا دوسرا اہم دور غالب، ذوق، مومن اور داغ کے عہد کو کہا جاتا ہے اُس عہد کے شعراء کرام میں ”خاقانی ہند“، شیخ محمد ابراہیم ذوق کے قصیدے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دبستان لکھنؤ سے متعلق شاعروں میں منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی اور جلال لکھنؤ وغیرہ نے قصیدہ نگاری کے قافلے کو آگے بڑھایا۔ محسن کا کوروی اور عزیز لکھنوی نے نعتیہ قصیدوں کے ذریعہ اردو میں قصیدہ نگاری کو نئی آب و تاب بخشی۔

قصیدہ نگاری چونکہ درباروں اور ریاستوں سے وابستہ تھی اس لیے راجا رجاؤں بادشاہوں نوابوں اور رئیسوں کے خاتمے کے ساتھ ہی اس صنف کا بھی زوال ہو گیا۔ اب اس کی حیثیت قصہ پارینہ کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ علم و ادب اور فنون لطیفہ کے فروغ میں قصیدہ نگاری کی حیثیت مضبوط کڑی جیسی رہی ہے۔

مرزا محمد رفیع سودا

مرزا محمد رفیع نام، سودا تخلص۔ سودا کی ولادت ۱۷۱۲ء میں بمقام دہلی ہوئی۔ آپ کے والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا، جو سودا گری کے لیے مشہور تھے۔ سودا نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص سودا اپنایا۔ آپ کے بزرگوں کا وطن بخارا و کابل تھا لیکن سودا گری اور تجارت کی غرض سے انہوں نے ترک وطن کر کے ہندوستان کو اپنا وطن ثانی بنایا۔

سودا کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی آپ بڑے ذہین اور شوخ طالب علم تھے اس لیے کتابی علم پر مجلسی علم کو ترجیح دیتے تھے۔ انہیں اپنے وقت کے مروجہ علوم و فنون خصوصاً عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ جس وقت سودا کے والد کا انتقال ہوا تب سودا بالغ ہو چکے تھے۔ سودا کے والد نے محنت و مشقت سے کمائی ہوئی بہت سی دولت ترکے کے طور پر چھوڑی تھی لیکن سودا نے یارباشی اور احباب پرستی میں سب کچھ لٹا دیا۔ اسی لیے انہیں مجبوراً کبھی فوج میں نوکری کرنی پڑی اور کبھی مصاحب پیشہ ہونا پڑا۔ پہلے پہل وہ محمد شاہ کے خواجہ سرا بسنت علی خاں کے ملازم ہوئے۔ پھر سیف الدولہ احمد علی خاں اور ان کے بعد غازی الدین خاں عماد الملک سے وابستہ ہوئے۔ جب دہلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو سودا دہلی سے فرخ آباد چلے گئے۔ اور نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہنچے۔ آصف الدولہ نے انہیں ”ملک الشعراء“ کا خطاب دے کر چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ سودا نے ۱۷۸۱ء میں اس دارفانی سے کوچ کیا۔

سودا کو بچپن ہی سے شاعری کا ذوق و شوق تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے سلیمان قلی و داد سے مشورہ سخن کیا، پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے اور آخر میں خان آرزو سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے

کثرتِ مشق نے جلد ہی سودا کو استاد کی مرتبے پر پہنچا دیا۔ سودا اردو کے مسلم الثبوت شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور میدان غزل میں بھرپور کمال دکھایا لیکن قصیدہ نگاری کو معراج کمال تک پہنچانے کے سبب آپ کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ مرثیہ نگاری کی حیثیت سے بھی سودا کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

بحیثیتِ قصیدہ نگار اور ہجو نگار سودا یکتا اور لاثانی نظر آتے ہیں۔ ان کے قصیدے نازک خیالی، بندش کی چستی، الفاظ و تراکیب کی ندرت، تشبیہات و استعارات کی جدت، فصاحت و بلاغت اور سلاست و روانی کے عمدہ نمونے قرار دیے جاتے ہیں۔ مشکل زمینوں میں کہے گئے ان کے قصیدوں میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو کسی بھی قصیدے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہیں۔ سودا نے ہر قسم کے قصیدے کہے ہیں۔ سودا کا قصیدہ ”اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل“ حضرت علی کی منقبت کے بطور کہا گیا ہے۔ یہ قصیدہ ”باب الجنت“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس قصیدے کے مطالعے سے یہ علم ہوتا ہے کہ سودا کو حضرت علی کی ذات والا صفات سے گہری عقیدت تھی۔ حضرت علی کے فضل و کمال اور شجاعت و سخاوت کا تذکرہ سودا نے جن پرشکوہ الفاظ میں سے کیا ہے اس کی داد دیتے ہوئے بنتا ہے۔ یہ قصیدہ سودا نے فارسی قصائد کی طرز اور زمین میں کہا ہے، کیونکہ فارسی شعرا عرتی، شیرازی اور انوری نے انھیں ردیف و قوافی میں سودا سے قبل اپنے قصیدے پیش کیے تھے۔ سودا کے اس قدم کو ہم مستحسن قرار دے سکتے ہیں، کیونکہ ایک چراغ سے کئی دوسرے چراغ روشن ہوتے ہیں۔

مرزا محمد رفیع سودا

قصیدہ باب الجنّت (در منقبت حضرت علیؑ)

تیغِ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عزّوجل
ڈال سے پاتِ تلک پھول سے لے کرتا پھل
آبجو قطع لگی کرنے روش پر محمل
پوششِ چھینٹ قدمکار بہرِ دشت و جبل
کار نقاشی مانی ہے دوم وہ اول
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
لوٹے ہے سبزہ پہ از بس کہ ہوا ہے بے کل
شع ساں گرمیِ نظارہ سے جاتی ہے پگھل
شاخ میں گاؤِ زمیں کے بھی جو پھوٹے کونیل
خلق کے وہم غلط کار میں ٹھہرے ہے مثل
اس یقیں میں نہ گماں کر سکے زہار خلل
ہے عمل بھی وہی تیرا، جو خدا کا ہے عمل
کرے تاثیر نہ عیسیٰ کا مداوا، نہ کسل
ہوا اشارہ جو ترا تیر قضا کو، کہ نہ چل
ہاتھ سے، کام زمانے کے ہیں جائے بچل

اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل
سجدہ شکر میں ہے شاخِ ثمر دار ہر اک
قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ
بخشتی ہے گلِ نو رُستہ کی رنگ آمیزی
عکسِ گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے
تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے نگرگ
بارِ آبِ رواں عکسِ ہجومِ گل کے
شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
جوشِ روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں
تیری قدرت بہ جہاں قدرتِ حق کی خاطر
مرضی حق، تیری مرضی سے ہے جو ہر فرد
علم تیرا نہیں کچھ علمِ خدا سے باہر
رائے تیری کے موافق، جو نہ لکھے نسخہ
سر کے پیکاں نہ قبضے سے کماں کے سر مو
ٹک تری مرضی سے باہر جو کرے کام جہاں

معنی علت غائی، جونہ ہو، تو اُن کا
 سایہ میں دست کرم کے ترے ہر صبح و مسا
 دین و دنیا کی ہے اشیا سے کہیں وہ اعلیٰ
 جو گدا ہے بہ جہاں تیرے گداے درکا
 چاہتا ہے کرے آخر وہ دعائیہ پر
 برگ پیدا کرے تاباغ میں ہر ایک نہال
 تاملے خلعتِ نوروز بہ بستان جہاں
 تالب جو، پہ کرے خیمہ کو استادہ حباب
 شاخ کے ہاتھ میں تاہو بہ چمن ساغر گل
 تابہ مے خانہ پینیں بادہ گلگوں مے خوار
 پھرے تاباغ میں ہر اک روش پر سرخوش
 مہ کے پرتو سے ہو تاچاک گریبان کتاں
 قدر ہو عود کی تا، مجر و آتش سے فزوں
 تاسمعی رہے یہ نظم بہ باب الجحت

خانہ ہر دو جہاں پھر ہوں دو بیت مہمل
 دولت ہر دو جہاں سے ہو غنی عبد اقل
 ہووے جو شے تری اشیا میں سبھوں سے اسفل
 اس کے درکا وہ گدا کہیے جسے اہل دَوَل
 نظم تجھ مدح کی بہترز کلام اوّل
 پھوٹے تانامیہ سے شاخِ شجر میں کونپل
 پاوے تاثیرِ اعظم، شرف از بُرج حمل
 تابجھادے بہ ریش سبزہ، فروشِ مخمل
 گل کے جب تک رہے، غنچہ کی صراحی بہ بغل
 ساتھ مطرب کے بجے تا دف و نئے چنگ و دُہل
 راہ چلتے میں قدم مست کا، تا جائے پھسل
 گل سے خورشید کے تا عشق رکھے دانہ طل
 لطفِ یوتار ہے عالم میں بہ چوبِ صندل
 جب تلک اس سے بر آوے مری امید وائل

نخل امید سے اپنے ہوں برومند محبت

ہو محبت نہ تری جن کو نہ پاویں وہ پھل

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
رانج، رواج کے مطابق چلی آرہی	مروجہ
علم کی جمع یعنی طرح طرح کے علم	علوم
فن کی جمع یعنی مختلف قسم کے فن	فنون
حبیب کی جمع یعنی دوست، عزیز، پیارا	احباب
جو ثبوت کا محتاج نہ ہو مانا ہوا	مستلم الثبوت
کسی چیز یا کیفیت و حالت کی زیادتی	بازار گرم ہونا (محاورہ)
بے مثال، بے نظیر، یگانہ، یکتا	لاثنائی
ضامن، گواہ، شاہد	ضمانت
نیک، پسندیدہ، خوب، بہتر	مستحسن
جنت کا دروازہ	باب الجنت
تعریف، ثنا	مدح
حضرت علی، خلفاء راشدین اور دیگر بزرگان دین کی مدح	منقبت
کو منقبت کہتے ہیں	
بہمن، چالاک، ذہین، برستا ہوا بادل دے	بہمن و دے
ستھسی سال کا دسواں مہینہ، ماگھ	
پھلواری، گلزار، پھولوں کا قطعہ	چمنستاں

عمل	کام دھندا، کاروبار، تعمیل
تیغ اُردی	تیغ، بمعنی تلوار یا شمشیر اُردی ایرانیوں کا دوسرا مہینہ جو ہندی جیٹھ کے مطابق ہوتا ہے
ملک خزاں	ملک راج، ولایت، دیش، خزاں، پت جھڑ، فصل خریف
مستاصل	جڑ سے اکھڑا ہوا، برباد، تباہ
سجدہ شکر	وہ سجدہ جو خدا کے حضور کسی بات کے شکرانے کے لیے کیا جائے
شاخِ شمردار	پھلوں سے لدی ڈالی یا ٹہنی
کرم عَزَّوَجَل	اللہ کی عنایت و مہربانی
قوت نامیہ	بڑھنے کی قوت و طاقت
نباتات	نبات کی جمع یعنی سبزیاں، ترکاریاں
عرض	چوڑائی، پاٹ، گزارش، التماس
خلعت	وہ پوشاک جو بادشاہ یا امرا کی طرف سے بطور عزت افزائی ملے، تحفہ، عطیہ، تحسین،
نوروز	سال کا پہلا دن، ایرانیوں کا قومی جشن
آب جو	چشمہ، ندی، نہر کا پانی
قطع کرنا	کاٹنا، تراشنا، چھوڑنا
روش	طور، طریقہ، رفتار، ڈھنگ، چلن
گل نورستہ	نیا، تازہ اور نوخیز پھول
رنگ آمیز	رنگ سازی، نقاشی، مصوری

لباس غلاف	پوشش
دشت بمعنی جنگل، صحرا، بیابان،	دشت و جبل
جبل بمعنی پہاڑ	
پھولوں کی پرچھائی، سایہ پر تو	عکس گل بن
مصوری یا نقش و نگار بنانے کا کام، گل کاری	کارنقاشی
(۲۷۶ تا ۲۷۷) کا ایک مشہور و معروف نقاش جو نبوت	مانی
کا جھوٹا دعویٰ کرتا تھا اور نقاشی کو اپنا معجزہ بتاتا تھا۔	
اولے یا ژالے کی صورت میں برسنے والے موتی	گہر ہائے تگرگ
شجر کی جمع یعنی بہت سے درخت، پیڑ	اشجار
بہتا ہوا پانی، ایک قسم کا باریک کپڑا	آب رواں
بہت سے پھول یعنی گلشن گلزار، چمنستان	ہجوم گل
بے چین، بے قرار، بے تاب	بے کل
شمع کی طرح روشن اور نورانی	شمع ساں
حرارت دیدار	گرمی نظارہ
نباتات (ہریالی) کے اگنے یا نمودار ہونے کا جوش	جوشِ روئیدگی
قدیم خیال کے مطابق وہ بیل جس کے ایک سینگ	گاؤز مین
پر زمین رکھی ہوئی ہے	
شان خداوندی اللہ تعالیٰ کی طاقت	قدرتِ حق
دنیا کے لوگ، مخلوق آفرینش	خلق

شک بے اعتباری، دماغ کی وہ قوت جو فاسد خیال پیدا کرتی ہے	وہم
جیسا، ملتا جلتا، ہم شکل، یکساں	مثل
رضائے الہی، اللہ تعالیٰ کی مرضی	مرضی حق
جیسے مانند، مثل	جوں
بے نظیر موتی، وہ جو ہر جس کا ثانی نہ ہو	جو ہر فرد
شک بے اعتباری، وہم	گماں
ہرگز، کبھی نہیں، خبردار	زنہار
خرابی، رختہ، سودا، دیوانگی	خلل
مطابق، یکساں، برابر، مشابہ	موافق
کاغذ کا وہ پرزہ جس پر طبیب دوا تجویز کرتا ہے	نسخہ
اثر، نتیجہ، پھل، خاصیت	تاثیر
علاج، دوا، معالجہ، درماں، چارہ	مداوا
سستی، کاہلی، تھکان، تھکاوٹ	کسل
برچھی یا بھالے کی انی، نیزے کی نوک	پیکاں
خمیدہ، لچک دار، قیادت، سرداری	کماں
بال کے برابر، بال کے مانند	سرِ مو
قضا کا حملہ، موت	تیر قضا
ذرا، کچھ، تھوڑا	ٹک
نتیجہ، مقصود، اصلی، ما حاصل، پھل	علت غائی

گھر، مکان، بیت	خانہ
دونوں جہاں، یعنی دنیا و عقبیٰ	ہردو جہاں
دو اشعار یعنی چار مصرعے	دو بیت
ترک کیا ہوا، بیکار، فضول، بے معنی	مہمل
چھاؤں، پرتو، حفاظت، حمایت، سرپرستی	سایہ
عنایت و مہربانی کا ہاتھ	دستِ کرم
صبح و شام	صبح و مسا
آسودہ، دولت مند، مطمئن، بے نیاز	غنی
عبد، معنی بندہ، غلام، ملازم، خادم، اقل بہ معنی بہت تھوڑا	عبدالقل
کم سے کم، قلیل ترین	
شے کی جمع یعنی چیزیں	اشیا
نہایت نیچا، ادنیٰ	اسفل
فقیر، بھکاری، منگتا	گدا
چوکھٹ، دروازہ	در
دولت مند، مال دار	اہلِ دَوْل
دعا سے منسوب، قصیدے کے وہ اشعار جو بطور دعا کے	دعائیہ
کہے جاتے ہیں	
پتہ، ورق	برگ
تازہ لگایا ہوا پودہ، خوش و خرم	نہال

تا	تک، تاکہ، جب تک
شاخِ شجر	درخت کی ٹہنی یا ڈالی
لپ جو	ندی کا کنارہ
خیمہ	ڈیرہ، تنبو، خرگاہ
استادہ	کھڑا ہوا
حاب	پانی کا بلبہ
روشِ سبزہ	چمکتی ہوئی شادابی یا ہریالی
فروشِ مخمل	مخمل کی فرش، مخملی زمین
ساغرِ گل	پھولوں بھرا شراب کا پیالہ
بہِ بغل	بغل یا پہلو میں
مے خانہ	شراب خانہ، میکدہ
گلگلوں	گلاب کی طرح، سرخ رنگ کا
مے خوار	میکش، شراب پینے والا، بادہ کش
مُطرب	گانے والا گویا
دف و نئے	دف: ایک ہاتھ سے بجانے والا ساز، نئے بانسری
چنگ و دُہل	ڈھول، نقارہ، ستار کی قسم کا ایک باجہ
سرخوش	خوش حال، مسرور، مگن
مہ	چاند، قمر، ماہتاب
کتاں	ایک قسم کا باریک کپڑا، جس کی نسبت مشہور ہے

کہ چاندنی میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے	خورشید
سورج، آفتاب، مہر	دانہِ طل
سونے کا دانہ سنہری دانہ	عود
ایک قسم کی عمدہ لکڑی جو آگ میں جل کر عمدہ خوشبودار بنتی ہے	مُجمر و آتش
وہ برتن جس میں خوشبودار چیزیں جلاتے ہیں، عود دان	فزون
زیادہ بڑھا ہوا	لطفِ بو
خوش بو کی لذت یا مزہ	چوبِ صندل
صندل کی لکڑی	مستمی
موسوم کیا گیا، نام رکھا گیا، پکارا گیا	امید وائل
آرزو، خواہش، تمنا	نخلِ امید
امید یا خواہش کا درخت	برآوے (مخاورہ)
حاصل ہونا، پورا ہونا	برومند
پھل پانے والا، فائدہ اٹھانے والا	محب
محبت کرنے والا، مشفق، شفیق	

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ قصیدہ ”اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل“ کس کی مدح میں لکھا گیا ہے؟
- ۲۔ سودا کا پورا نام لکھیے۔
- ۳۔ قصیدہ ”اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل“ کس نام سے مشہور ہے؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ سودا نے اپنا تخلص سودا کیوں رکھا تھا؟
- ۵۔ مانی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
- ۶۔ لفظ ”خورشید“ کے مترادف الفاظ لکھیے۔

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ سودا کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات بتائیے۔
- ۸۔ سودا کے حالات زندگی تحریر کیجیے۔

محمد ابراہیم ذوق

شیخ محمد ابراہیم نام، ذوق تخلص۔ ۱۷۸۹ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ذوق کے والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا جو سپاہی کے عہدے پر مقرر تھے۔ ذوق کی ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول شوق کے مکتب میں ہوئی۔ حافظ صاحب چونکہ خود بھی شاعر تھے اس لیے ان کے یہاں شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہوتی رہتی تھیں۔ تاہم ذوق کو بھی بچپن سے شاعری کا چسکا لگ گیا۔ وہ اپنے کلام پر حافظ غلام رسول شوق سے اصلاح لینے لگے اور استاد کے تخلص کی رعایت سے ذوق تخلص اپنالیا۔

حافظ غلام رسول شوق کے مکتب سے تعلیم مکمل کر کے ذوق مولوی عبدالرزاق کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ یہاں ذوق کی ملاقات مولانا محمد باقر اور میر کاظم حسین بے قرار سے ہوئی اور چند دنوں میں ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ چونکہ میر کاظم حسین شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے، اس لیے ذوق نے بھی نصیر دہلوی کی شاگردی اختیار کر لی۔ اب ذوق کی شاعری کو پر لگنے لگے۔ ۱۹ برس کی عمر میں ذوق کی رسائی آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تک ہو گئی۔ ظفر نے ذوق کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انھیں اپنا استادِ سخن بنا لیا۔

ذوق کی شاعرانہ شخصیت کے پیش نظر اکبر شاہ ثانی نے انھیں ”خاقانی ہند“ اور بہادر شاہ ظفر نے ”ملک الشعراء“ کے خطاب سے نوازا۔ ذوق نے اپنے بیش تر قصیدے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہے ہیں۔ عجز و انکساری، قناعت پسندی اور درویش صفت طبیعت کے مالک ذوق کا انتقال ۱۵ اکتوبر ۱۸۴۵ء کو بمقام دہلی ہوا اور ذوق دہلی میں ہی پیوندِ خاک ہوئے۔

ذوق بلند پایہ شاعر تھے، انھوں نے جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن انھیں قصیدہ نگار کی

حیثیت سے زیادہ شہرت ملی۔ ذوق کے قصیدے الفاظ و معنی کا بھرپور ذخیرہ ہیں۔ ان کی متانت و سنجیدگی کی وجہ سے یہ قصیدے مضحکہ خیز نہیں ہوتے۔ الفاظ کی بندش، زبان کی صفائی، محاوروں کا بر محل استعمال اور علمی اصطلاحات نے ذوق کے قصیدوں کو پُر وقار بنا دیا ہے۔ ذوق کے قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فن موسیقی علم نجوم، علم فقہ، علم طب، فلسفہ، حدیث اور تاریخ وغیرہ میں بھی قدرت حاصل تھی۔ ذوق نے سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں قصیدے کہہ کر اپنی شاعری کا لوہا منوالیا ہے۔ اُن کے دیوان اور کَلّیات شائع ہو چکے ہیں جن میں دیگر اصناف کے ساتھ قصیدوں کی خاصی تعداد ہے۔

ذوق کا قصیدہ ”ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی“ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہا گیا ہے۔ اس قصیدے کا شمار ذوق کے بہترین قصیدوں میں ہوتا ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب میں ذوق نے ساون کے مہینے کی ریم جھم کا پُر سرور اور پر کیف منظر دکھایا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ عید کے چاند کی خوشی موسم کی خوش گواری کے سبب دو بالہ ہو گئی ہے۔ ہوا کی تاثیر اور باغ کی آرائش کا بیان ذوق کی قوت شاعرانہ کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

اس قصیدے کی گریز اور مدح کے اشعار بھی قابل تعریف ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اے بادشاہ تیرے دیدار سے مشرف ہو کر تمام عالم عید منارہا ہے۔ ہم جسے عید کا چاند کہتے ہیں دراصل وہ تیرے ابرو کا عکس ہے تیرے مقام و مرتبے کا یہ عالم ہے کہ بادشاہ جمشید اپنی بزم عیش و عشرت کو تیرے عکس سے ادھار لے کر رونق بخشا ہے۔

قصیدے کے آخر میں ذوق اپنے ممدوح بہادر شاہ ظفر کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے بہادر شاہ میں ٹھیک طرح سے یا مکمل طور پر تیری تعریف نہیں کر سکا۔ اے بادشاہ تیری جلوہ نمائی اور دیدار ہمیں اسی طرح شان و شوکت کے ساتھ ہر عید کے موقع پر ہوتے رہیں۔ تیری رعایا ہمیشہ تجھ سے فیض یاب ہو اور تو اسی طرح مسند شاہی پر جلوہ افروز ہو کر اس کی رونق بڑھاتا رہے۔

قصیدہ درمدح بہادر شاہ ظفر

برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی
 ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتیِ طلائِی
 کس رنگ سے ہوں ہاتھ، نہ مے کش کے حنائی
 ساقی نے ہے آتش سے مے تیز اڑائی
 ہووے نہ مُمیز، گڑہ ناری و مائی
 ہرنالے کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی
 تالاب سمندر کو کرے چشمِ نمائی
 کافور کی تاثیر گئی، جو زمیں پائی
 معشوق کا گھر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی
 گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوئی
 ہے مدرسہ میں بھی، سبقِ صرفِ ہوئی
 زاہد کا بھی ہر دانہ تسبیحِ ریائی
 گویا کہ ہے مینائے مے کا ہر ربائی
 کرتی ہے نسیم آ کے، کبھی لٹخا سائی

ساون میں دیا، پھر مہ شوال دکھائی
 کرتا ہے ہلال، ابروئے پُرخم سے اشارہ
 ہے عکسِ فگن جامِ بلوریں سے مے سُرخ
 کوندے ہے جو بجلی، تو یہ سو جھہ ہے نشہ میں
 یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
 پہنچا کمک لشکرِ باراں سے یہ زور
 ہر قلزمِ عمّاں پہ لب جو، مُتہم
 ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام یہ سردی
 سردی حنا پنچے ہے، عاشق کے جگر تک
 عالم یہ ہوا کا ہے، کہ تاثیرِ ہوا سے
 کیا صرفِ ہوا ہے طرب و عیش کا عالم
 خالی نہیں مے سے، روشِ دانہ انگور
 جو آئینہ دل ہے، وہ عاشق کی بغل میں
 کرتی ہے صبا آ کے کبھی مشکِ فشانئی

تھا سوزنی خار کا، صحرائیں جہاں فرش
شاہا! ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق
کہتے ہیں مہ نو جسے ابرو نے وہ تیری
پرتو سے تیرے جام مئے عیش سر بزم
ٹپکے لب ساغر سے ، وہ قطر کر دی شکل
کیا علم سمائے ترا، سینہ میں فلک کے
پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلع موزوں
یوں کرسی زر پر ہے تیری جلوہ نمائی
رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا سامنے جس کے
گمرہ کو ہدایت ، جو تیری راہ پہ لائے
تا ناخن شمشیر، نہ ہو ناخن تدبیر
خورشید سے افزوں ہو، نشاں سجدہ کا روشن
عکسِ رُخ روشن سے تیرے جوں پد بیضا
مانع جو ہوا دستِ درازی کو ترا عدل
زنجیر میں جو ہر کے رہے تیغ ہمیشہ
دیتا ہے دعا ذوق کو مضمون ثنا میں

سبزہ نے وہاں تحملِ خوش رنگ بچھائی
عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی
کی آئینہ چرخ میں ہے عکس نمائی
لے ساغرِ جمشید کرے کارِ روائی
ہو مثلِ فلک جس میں تماشائیِ خدائی
دریا کی کہاں ہو سکے، کاسہ میں سمائی
احسنت کہیں سن کے ، بہائی و سنائی
جس طرح کہ مصحف ہو، سرِ حلِ طلائی
ہے بحر بھی کشتی بہ کف، از بہر گدائی
رہزن بھی اگر ہو، تو کرے راہ نمائی
دشمن کی ترے ہو، نہ کبھی عقدہ کشائی
گر چرخ کرے، در کی ترے ناصیہ سائی
کرتا ہے کفِ آئینہ اعجاز نمائی
پروانہ کو بھی شمع نے انگلی نہ لگائی
خون ریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رہائی
ہے ذہنِ رسا کو، یہ کہاں اس کے رسائی

ہر سال شاہا! ہووے مبارک یہ تجھے عید

تو مسندِ شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
سجا ہوا، سنوارا ہوا	آراستہ
لحاظ، خیال، مناسبت	رعایت
تعریف کے طور پر اچھا نام، کسی بادشاہ یا حکومت کی طرف سے دیا گیا اعزازی نام	خطاب
عالی مقام، عالی رتبہ	بلند پایہ
تمام کُل	جملہ
ہنسی مذاق میں ڈالنے والی بات	مصحکہ خیز
وقت یا موقع کے عین مطابق	بر محل
ستاروں کا علم	علم نجوم
علم دین، شریعت کا علم	علم فقہ
مشکل، دُشوار، پتھر جیسی سخت	سنگلاخ
کسی کی اُستادی کا قائل ہونا، کسی کو اپنے سے بڑا ماننا	لوہا منوانا (محاورہ)
کل کی جمع یعنی ایک ہی شخص کی منظومات یا تصنیفات کا مجموعہ	کلیات
معزز، عزت بخشا گیا	مشرّف
خاص بناؤ سنگھار یا سج دھج کے ساتھ سامنے آنا،	جلوہ افروز

کسی مخصوص انداز کے ساتھ نمودار ہونا	مہ شوال
عید کا چاند، دسواں قمری مہینہ	قدح کش
شراب پینے والا	ہلال
چاند	ساقی
شراب پلانے والا	بادہ
شراب	کشتی طلائی
سنہری سونے کی کشتی یعنی شراب کا پیالہ	جام بلوری
بلوری (صاف شفاف پتھر) کا پیالہ جس میں شراب پی جاتی ہے	مے سُرخ
سُرخ شراب	مے کش
شراب پینے والا	حنائی
مہندی کا رنگ یعنی سُرخ رنگ	مے تیز
تیز شراب	باراں
بارش	ممیز
ایک چیز کے مقابل میں دوسری چیز میں فرق ہونا	گرۃ ناری ومانی
آگ اور بجلی	قلزم عمّاں
ایک نہر کا نام	متبسم
مسکرانے والا	چشم نمائی
آنکھیں دکھانا	کافور
کپڑوں کا نام ایک خوشبو کا۔ بہشت کا ایک ٹھنڈا چشمہ	

ہاتھ کی مہندی	دستِ حنائی
آسمان	گردوں
مجازِ باغ کی پڑی	طرز
عبادت گزار	زاہد
دکھاوے کی تسبیح	تسبیحِ ریائی
ایک چشمہ جو ہوا لگنے سے جم جاتا ہے	کاہِ ربائی
خوشبو پھیلانا	مشکِ فشانے
مختلف خوشبوؤں کو بکھیر دینا	نخلخسائی
کانٹوں کا جال	سوزنی خار
عکس	پرتو
بادشاہ کا ساغر (شراب کا پیالہ)	ساغرِ جمشید
پیالہ	کاسہ
بہت خوب	احسنت
قرآن شریف، آسمانی کتابیں	مصحف
لکڑی کی رحل (جس پر قرآن شریف رکھ کر تلاوت کرتے ہیں)	رحل
سخی ہاتھ، بخشش	دستِ سخا
دریا	بحر
ہاتھ پھیلانا	بکف
لیے	واسطے

مانگنا	گدائی
رازجانا	عقدہ کشائی
زیادہ	افزوں
سجدے کرنا	ناصیہ سائی
ہاتھ روشن اور سفید	ید بیضا
کرشمہ دکھانا	اعجاز نمائی
ایک پرندہ، عنقا جو بہت اونچائی پر ہو	سیمرغ
منع کرنے والا، روکنے والا	مانع
انصاف	عدل
خون گرانے والا، خونی	خونریز
تعریف	ثناء
پہنچنے والا	رسا
پہنچ	رسائی

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ ”مہ شوال“ کسے کہتے ہیں؟
- ۲۔ قصیدہ ”ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی“ کس کی مدح میں لکھا گیا؟
- ۳۔ بہادر شاہ ظفر نے ذوق کو کس خطاب سے نوازا تھا؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ لفظ ”خوں ریز“ کے دو مترادف الفاظ لکھیے۔
- ۵۔ لفظ ”ہلال“ کے دو متضاد الفاظ لکھیے۔
- ۶۔ ذوق کی تاریخ ولادت و وفات مع مقام تحریر کیجیے۔

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ قصیدہ ”ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی“ کے ابتدائی پانچ اشعار کی تشریح کیجیے۔
- ۸۔ قصیدے کے اجزائے ترکیبی تحریر کیجیے۔

ڈاکٹر قائد علی خاں

مرثیہ

تعریف و تاریخ

مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی کسی مرنے والے کی تعریف اور توصیف کر کے اس پر غم کا اظہار کیا جانا ہے۔ اردو میں بیشتر مرثیے حضرت امام حسینؑ اور شہدائے کربلا پر لکھے گئے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں کربلا کا واقعہ ایک بڑا سانحہ ہے جس میں پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے پیارے نواسوں اور ان کے رفقا کی شہادت کا درد انگیز اور پُر آشوب واقعہ پیش آیا۔ اسی دردناک اور الم ناک واقعہ کو مرثیہ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اردو میں مرثیہ کا آغاز دکن سے ہوا۔

ڈاکٹر رشید موسوی نے برہان الدین جام کو پہلا مرثیہ گو قرار دیا ہے۔ قلی قطب شاہ جو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے اور جس کے دیوان میں پانچ مرثیے شامل ہیں بعض مورخین نے قلی قطب شاہ کو ہی پہلا مرثیہ گو تسلیم کیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے سب سے پہلے مرثیے عرب میں دور جاہلیت میں لکھے گئے اس کے بعد ایران میں مرثیہ گوئی کو فروغ ملا جہاں محتشم کاشی اور ملا مقبل نے اسی روایت کو آگے بڑھایا۔ اردو میں مرثیے کے نقوش زبان کی ابتدا سے ہی ملتے ہیں۔ دکن میں عادل شاہی، قطب شاہی اور نظام شاہی حکومتوں کے دور میں مرثیہ گوئی کا خوب رواج تھا۔ دکن کے کم و بیش ہر چھوٹے بڑے شاعر نے سانحہ کربلا پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ شمالی ہند میں فضلی نے اردو نثر کی پہلی تصنیف ”کربلا کتھا“ میں بھی واقعات کربلا پیش کیا ہے۔ شمالی ہند میں محمد شاہ کے عہد میں جو مرثیے لکھے گئے ان میں مسکین، حزین اور غمگین وغیرہ کے نام

قابل ذکر ہیں۔ دہلی میں میر اور سودا نے اپنی عمر کے آخری دور میں لکھنؤ آ کر بڑے جوش اور عقیدت سے لبریز مرثیے کہے۔ سودا نے کل ۷۲ مرثیے لکھے ہیں۔ انہوں نے مرثیہ میں سب سے پہلے مسدس کی ہیئت (Form) استعمال کی جو بعد میں مرثیوں کے لیے مخصوص ہو گئی۔ میر نے بھی اپنے مرثیوں میں شہادت کے پہلو کو بخوبی پیش کیا ہے۔

شمالی ہند میں میر اور سودا کے بعد تقریباً ہر شاعر نے مرثیے کہے ہیں۔ لکھنؤ میں میر حسن، میر امان، درخشاں، صبر وغیرہ نے بھی اردو مرثیہ کی روایت کو آگے بڑھایا۔ یہاں قابل ذکر ترقی میر ضمیر کے ہاتھوں ہوئی۔ ضمیر نے نہ صرف واقعات کر بلا کو شاعرانہ استدلال کے ساتھ پیش کیا بلکہ اس میں فنی لوازمات یعنی اجزائے ترکیبی بھی متعین کیے جو بعد میں اردو مرثیہ نگاری میں لازمی قرار دیے گئے۔ اسی دور کے نامور اور مقبول شعرا میں خلیق اور فصیح بھی تھے جنہوں نے اردو مرثیے میں اضافہ کیا۔ ضمیر، خلیق اور فصیح کا عہد لکھنؤ کا عروج تو نہیں کہا جاسکتا لیکن مرثیہ نگاری کی سب سے تابناک دور کی ہمواری کا دور کہا جاسکتا ہے۔ چونکہ یہ زمانہ لکھنؤ میں نوابوں کا زمانہ تھا جو فرقہ امامیہ (شیعہ) کے پیرو تھے اور جو حضرت امام حسینؑ اور شہدائے کربلا سے بے حد محبت و عقیدت رکھتے تھے اس لیے مرثیہ نگاروں کو درباری سرپرستی بھی حاصل ہوئی۔

لکھنؤ میں اردو مرثیہ نگاری کا ایک اہم دور میر انیس اور مرزا دبیر سے شروع ہوا جسے اردو مرثیہ کا سنہری دور کہا جاسکتا ہے۔ حالاں کہ اس وقت مرثیے کی ترقی یافتہ شکل ان کے سامنے تھی لیکن دونوں شعرا نے جوش و عقیدت کے والہانہ پن، خیالات کی جدت، زور بیان، فصاحت و بلاغت، نادر تشبیہات، استعارات، چست الفاظ، محاوروں کے ساتھ جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور مناظر فطرت کے اعلیٰ نمونے پیش کر اردو مرثیہ کو بام عروج عطا کیا۔ انیس اور دبیر کے بعد پیارے صاحب رشید کا نام آتا ہے جنہوں نے مرثیوں میں 'ساقی نامہ' اور بہاریہ کلام پیش کیا۔ شاد نے تصوف و الہیات کے مضامین

باندھے۔ اس کے علاوہ منس، گدا، افسردہ، حیدری، سکندر، نفیس، وحید، اوج، چھٹوالال دلیگر اور فصیح وغیرہ نے بھی مرثیہ گوئی کی روایت کو آگے بڑھایا۔

عام طور پر مرثیے واقعاتِ کربلا اور حضرت امام حسینؑ یا ان کے اعزہ و رفقا کی شہادت کے موضوع پر کہے جاتے ہیں لیکن اردو میں شخصی، قومی اور غیر مذہبی مرثیوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ جہاں تک شخصی مرثیوں کی بات ہے تو اس سلسلے میں حالی، اقبال، سرور جہاں آبادی، چکبست، صفی لکھنوی وغیرہ کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ جنہوں نے مختلف علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کی وفات پر اپنے جذباتِ غم کا اظہار کیا ہے۔

شخصی مرثیوں میں مولانا حالی کا ”مرثیہ غالب“ اور علامہ اقبال کا ”مرثیہ داغ“ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ دونوں مرثیے اپنے اساتذہ کی وفات پر لکھے گئے، جن میں اپنے غم اور قلبی واردات کو بڑی عقیدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شاملِ نصاب مرثیہ موسوم بہ ”مرثیہ غالب“ اردو کے شاہکار شخصی مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی جو غالب سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور آپ کے شاگرد کے ساتھ بڑے اچھے دوست بھی تھے۔ جب بھی دہلی میں رہے غالب کی صحبت سے فیض اٹھاتے۔ حالی اپنے استاد غالب اور ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے۔ جب ۱۸۶۹ء میں غالب کے انتقال کی خبر ہوئی تو انھیں اپنے فاضل استاد کی موت کا گہرا صدمہ ہوا چنانچہ انہوں نے اپنے غم اور صدمہ کا اظہار اس مرثیہ کی شکل میں کر کے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

میر انیس

میر برعلی نام انیس تخلص تھا۔ ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ میر خلیق کے فرزند اور میر حسن کے پوتے اور میر ضاحک کے پرپوتے تھے۔ گویا انیس کو شاعری ورثہ میں ملی۔ آپ کے دادا میر حسن اپنی مثنوی ”سحر البیان“ کے لیے بہت مشہور ہیں۔ آپ کے والد خلیق بھی اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ انیس نے ابتدائی کتابیں مولوی حیدرعلی سے اور عربی کا درس میر عباس سے لیا۔ گھر میں ہر وقت شعرو سخن کے چرچے رہتے تھے لہذا اس ماحول کا اثر انیس پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ میر انیس نے اوائل عمری سے شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے اپنے والد سے اصلاح لی پھر والد کے کہنے پر امام بخش ناسخ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ابتدا میں میر انیس کا حزیں تخلص تھا بعد میں ناسخ کی ناپسندیدگی کے سبب انیس اختیار کیا۔

میر انیس نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا لیکن اپنے والد کی اصلاح پر بہت جلد اس سے کنارہ کر سلام اور مرثیوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ انیس نے پہلا سلام نو سال کی عمر میں کہا۔ جوانی کے زمانے میں ان کا پورا خاندان لکھنؤ میں سکونت پذیر ہوا۔ اور یہیں تا عمر انیس نے اپنی شاعری کے جوہر دکھائے۔ جب تک لکھنؤ آباد رہا میر انیس یہاں سے کہیں نہیں گئے جب لکھنؤ اجڑا تو وہ پٹنہ، بنارس، الہ آباد اور حیدرآباد بھی گئے اور ہر جگہ ان کی قدر و منزلت ہوئی۔

انیس ورزش کے بہت شوقین تھے انہوں نے فن شہسواری اور سپہ گری کی بھی تعلیم حاصل کی۔ جو ان کی شاعری میں کافی مددگار ثابت ہوئی۔ وہ مزاج کے اعتبار سے بڑے خلیق اور وضع دار انسان تھے۔ خودداری کے سبب اکثر امیروں سے ملنے میں اجتناب کرتے تھے۔ کبھی کسی کی خوشامد میں شعر نہیں کہے۔ محمد حسین آزاد نے ’آب حیات‘ میں میر انیس کے مرثیوں کی تعداد کم سے کم دس ہزار بتائی ہے۔ جب کہ

امیر احمد دہلوی نے یادگار انیس میں مراٹی کی کل تعداد چودہ سو بتائی ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے ان کی تعداد دو سو پچاس بتائی ہے شاید یہ تعداد ان کے مطبوعہ کلام کی ہو۔ بہر کیف میر انیس نے کثیر تعداد میں مرثیہ کہے ہیں۔ انیس کے مرثیوں کی چار ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

انیس نے مرثیوں کے علاوہ غزلیں، رباعیات، قطعات اور سلام بھی خوب کہے ہیں۔ بالخصوص رباعیات بڑی پایہ کی کہی ہیں مگر ان کو اصل شہرت مرثیوں کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ میر انیس نے اردو مرثیہ میں تمام فنی لوازمات کو کمالات فن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے مرثیوں میں فصاحت و بلاغت کا عنصر ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ فارسی تراکیب اور محاوروں کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ صنائع بدائع نیز رعایت لفظی ان کی شاعری کی جان ہیں۔ وہ الفاظ کو شعروں میں اس طرح پروتے ہیں کہ اس کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے۔ وہ شاعری میں مصوری سے کام لیتے ہیں۔ تصویر بھی ایسی بناتے ہیں جو حقیقی معلوم ہوتی ہیں۔ مناظر فطرت کو اس خوبی سے پیش کرتے ہیں گویا قاری اس منظر کو آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہے۔

رزم و بزم کا نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے والے پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ بقول خود۔

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے بھڑک جائیں ابھی

بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

کلام میں تشبیہات اور استعارات کا استعمال شاعرانہ کمال کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مثلاً۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اس شعر میں اوس کو موتیوں سے تشبیہ دی ہے جو فصاحت سے لبریز ہے۔

انیس کے کلام میں تصنع یا بناوٹ نام کو نہیں ہے۔ ان کے مرثیوں کے کردار عرب سے تعلق رکھتے

ہیں۔ مگر ان کے طور طریق (رہن سہن) ہندوستانی ہیں۔ انیس کی شاعری جذبات کا حقیقی آئینہ ہے۔

انہوں نے اپنے مرثیوں میں اعلیٰ انسانی قدروں مثلاً محبت، سخاوت، شجاعت وغیرہ کو بے مثال ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ رزمیہ شاعری میں وہ فارسی کے مشہور شاعر فردوسی کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔

انیس کے مرثیوں میں منظر نگاری پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ مناظرِ فطرت کے بیان میں وہ یکتا نظر آتے ہیں چاہے صبح و شام کا منظر ہو، سردی یا گرمی کا بیان ہو، میدانِ کربلا میں جنگ اور شہادت کا منظر ہو۔ گویا ہر منظرِ نرالی شان کے ساتھ بیان کیا ہے ایک جگہ صبح کے منظر کا یہ عالم دیکھیے۔

دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی ہے

صاف غنچوں کے چٹخنے کی صدا آتی ہے

جذبات نگاری میں انیس کو خاص مہارت حاصل تھی۔ وہ واقعہ کربلا کے ہر موقع پر ہر فرد سے چاہے وہ آقا ہو یا غلام، دوست ہو یا دشمن، بچہ ہو یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت ہر ایک سے ویسی ہی بات کہلاتے ہیں جو فطرت کے عین مطابق ہو۔ انیس نے جذبات کی مختلف کیفیات اور مدارج کا لحاظ رکھتے ہوئے جذبات اور احساسات کی عمدہ نظیریں پیش کی ہیں۔

میر انیس نے اپنے مرثیوں میں کردار نگاری میں بھی کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ واقعہ کربلا میں جن ہستیوں کو خاص اہمیت حاصل ہے ان کی سیرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انیس کی خوبی یہ ہے کہ ان کے کرداروں میں یکسانیت کے باوجود انفرادیت نظر آتی ہے۔ انہوں نے ہر کردار کو اس کے مرتبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے پیش کیا ہے یعنی وہ کردار ماں، بہن، بیٹی، بہو، مالک یا نوکر ہے تو وہ کردار اسی مکمل شکل میں نظر آتا ہے۔ میر انیس کے مرثیوں میں تمام اجزا کا بیان ترتیب اور تسلسل کے ساتھ ہوا ہے۔ انیس کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ چاہے کردار نگاری ہو، جذبات نگاری ہو یا رجز، شہادت یا بین ہو ہر ایک جُز کو اور ان سے جڑے واقعات کو اس تسلسل اور خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے کا ذہن آگے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور وہ اس واقعہ کو پوری دلچسپی اور تجسس سے پڑھتا ہے اور یہی چیز ان کے مرثیوں کو عظمت بخشتی ہے۔

مرثیہ

امام حسین کی مدینے سے روانگی

فرزندِ پیمبر کا مدینے سے سفر ہے
سادات کی بستی کے اجڑنے کی خبر ہے
درپیش ہے وہ غم، کہ جہاں زیروزبر ہے
گل چاک گریباں ہیں صباخاک بہ سر ہے

گل رو صفت غنچہ کمر بستہ کھڑے ہیں
سب ایک جگہ صورت گل دستہ کھڑے ہیں

آراستہ ہیں بہر سفر سرو صبا پوش
عمامے سروں پر ہیں عبائیں بسر دوش
یاران وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش
حیراں کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش

منہ ملتا ہے رو کر کوئی سرور کے قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبر کے قدم پر

عباسؑ کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ
اب آنکھوں سے چھپ جائے گی تصویرِ ید اللہ
کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسمؑ کے ہوا خواہ
واللہ دلوں پر ہے عجب صدمہؑ جا نکاہ

ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا
یہ اُنس، یہ خُلقِ حسنٰی کون کرے گا

رخصت کے لیے لوگ چلے آتے ہیں باہم
ہر قلبِ حزیں ہے، تو ہر اک چشم ہے پُر نم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم
غل ہے کہ چلا دلبرِ مخدومہؑ عالم

خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبرِ نبیؐ کے
روضہ پہ اداسی ہے رسولِ عربیؐ کے

تدبیرِ سفر میں ہیں ادھر سبطِ پیمبر
گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسبابِ نکلواتے ہیں عباسِ دلاور
تقسیمِ سواری کے تردد میں ہیں اکبر

شہ کو جنہیں لے جانا ہے، وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہوا اصطلبل، چلے آتے ہیں گھوڑے

لے لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر
اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر
سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمیشہ
مسلم کا خط آ لے تو کریں کوچ کی تدبیر

لِلّٰہِ ابھی قبر پیمبر کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہ زہرا کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

منہ دیکھ کے اصغر کا چلا آتا ہے رونا
آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا
لکھا تھا اسی سن میں مسافر انھیں ہونا

کیا ہوگا جو میداں میں ہوا گرم چلے گی
یہ پھول سے کھلائیں گے، ماں ہاتھ ملے گی

ہے روح پہ اماں کی قلق کرتی ہیں زاری
سر پیٹتے میں نے انہیں دیکھا کئی باری
روداد بیاں کر گئی ہیں مجھ سے وہ ساری
فرماتی تھیں بھائی سے خبر دار میں واری

غم خوار ہے تو اور خدا حافظ جاں ہے
نہ باپ ہے سر پر مرے بچے کے نہ ماں ہے

یہ کہتی تھی نینب کہ پکارے شہِ عادل
تیار ہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل
طے شام تک ہوگی کہیں آج کی منزل
رخصت کرو لوگوں کو بس اب رونے سے حاصل

چلتی ہے ہوا سرد ابھی وقت سحر ہے
بچے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہے

رخصت کرو ان کو جو کہ ہیں ملنے کو آئے
کہہ دو کوئی گہوارہ اصغر کو بھی لائے
نادان سیکنہ کہیں آنسو نہ بہائے
جانے کی خبر میری نہ صغرا کہیں پائے

ڈر ہے کہیں گھبرا کے نہ دم اس کا نکل جائے
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے

چلاتی تھی کبرا کہ بہن آنکھ تو کھولو
کہتی تھی سیکنہ کہ ذرا منہ سے تو بولو
ہم جاتے ہیں تم اٹھ کہ بغل گیر تو ہولو
چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رولو

تم جس کی ہوشیدا وہ برادر نہ ملے گا
گھر بھر میں جو ڈھونڈو گی تو اکبر نہ ملے گا

صفرانے کہا کھانے سے خود ہے مجھے انکار
پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار
تبرید فقط آپ کا ہے شربت دیدار

گرمی میں بھی راحت سے گزر جائے گی بابا
آئے گا پسینہ تپ اتر جائے گی بابا

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لیے باہر
نہ فرش، نہ ہے مسندِ فرزندِ پیمبر
دالان سے کیا ہو گیا گہوارہٴ اصغر
اجڑا ہوا لوگو! نظر آتا ہے مجھے گھر

کچھ منہ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے اماں
کیا سبِ پیمبر سے وطن چھٹتا ہے اماں

کس سے کہوں اس درد کو میں بے کس ورنجور
بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں اور بھائی بھی ہیں دور
اماں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی میں ہوں مجبور
ہمراہی بیمار کسی کو نہیں منظور

دنیا سے سفر، رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
پیغمبر محمدؐ کی اولاد، آل رسولؐ	فرزندِ پیغمبر
حضرت علیؑ کی اولاد	سادات
اوپر نیچے	زیروزبر
گریبان کا پھٹا ہونا	چاک گریباں
سر پر مٹی ہونا	خاک بہ سر
کلی کی صفت	صفتِ غنچہ
موجود، حاضر	کمر بستہ
مراد تیار (سامان کے ساتھ)	آراستہ
سفر کے واسطے	بہر سفر
لمبے قد والے اچکن پہنے ہوئے	سرو قبا پوش
صاف	عمامے
جبہ، چغے	عبائیں
کاندھا	دوش
گلے ملنا	ہم آغوش
اللہ کے ہاتھوں کی تصویر	تصویرِ ید اللہ

جان نکالنے والا صدمہ، غم انگیزی	صدمہ، جانکاه
میٹھی اور عمدہ باتیں، بہترین شاعر	شیریں سخن
محبت، لگاؤ	انس
خوش اخلاقی	خلقِ حسنیٰ
غمگین دل	قلبِ حزین
بھگی ہوئی	پُر نم
پیارا محبوب	دل بر
دنیا کی خدمت کی گئی	مخدومہ عالم
قبر	روضہ
پیغمبرِ اسلام کے نواسے (حضرت امام حسنؓ و حسینؓ)	سبطِ پیمبر
دوست و احباب	یاور و انصار
محمل، اونٹ کا کجاوہ	هودج
بلند مرتبہ والے (حضرت امام حسینؓ)	شہِ ذی جاہ
حضرت امام حسینؓ کا لقب	شہیر
بہن	ہم شیر
افسوس، رنج	قلق
قصہ، حالت، حقیقت	روداد
انصاف کرنے والا بادشاہ	شہِ عادل
گلے لگنا (مجاورہ)	بغل گیر

عاشق، خدا	شیدا
سامان (سبب کی جمع)	اسباب
تکیہ لگا کر بیٹھنے کی جگہ	مسند
پالنا	گہوارہ
ٹھنڈا کرنا، ٹھنڈائی	تبرید
صرف، اکیلا، محض	فقط
بخار	تپ
لاچار، محتاج	بیکس
غم گین	رنجور
ساتھی	ہمراہی

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱- مرثیہ حضرت امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی کے شاعر کا نام بتائیے۔
- ۲- میر انیس اور میر ضاحک کا کیا رشتہ تھا؟
- ۳- میر حسن کی مشہور مثنوی کا نام بتائیے۔

مختصر سوالات:

- ۴- اردو کے چند مشہور مرثیہ نگاروں کے نام بتائیے۔
- ۵- مندرجہ ذیل مشکل الفاظ کے معنی بتائیے۔
تقصیر۔ تربت۔ سبط پیمبر۔ ہودج۔
- ۶- مندرجہ ذیل کے حضرت امام حسینؑ سے کیا رشتے تھے؟
حضرت صغرا۔ حضرت علی اکبرؑ۔ حضرت عباسؑ۔ حضرت فاطمہؑ۔

تفصیلی سوالات:

- ۷- میر انیس کے حالات زندگی مختصراً بیان کیجیے اور ان کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات بتائیے۔
- ۸- اس مرثیہ کے پہلے اور دوسرے بند کی تشریح کیجیے۔

خواجہ الطاف حسین حالی

الطاف حسین نام، حالی تخلص تھا ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ایزد بخش کا انتقال اس وقت ہوا جب حالی کی عمر نو سال تھی۔ ان کے مورث اعلیٰ خواجہ ملک علی ہرات سے ہندوستان اس وقت آئے جب غیاث الدین بلبن کی بادشاہی تھی۔ وہ پانی پت کے قاضی مقرر ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد حالی کی پرورش اور تعلیم کا ذمہ بہن بھائیوں نے اٹھایا۔ دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم عربی فارسی سے کی اور پھر حفظ قرآن پاک کی سعادت حاصل کی۔ حالی کو پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا موقع نہ ملا۔ تعلیم سے فراغت بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان کی شادی مرضی کے خلاف کر دی گئی۔ آخر کار پریشانی کے عالم میں دہلی کا رخ کیا۔ یہاں مولوی نوازش علی سے عربی کی تعلیم لی۔ رشتہ داروں کے کہنے پر واپس پانی پت آئے۔ غدر کے دوران پانی پت میں ہی دو چار سال گزارے اس دوران منطق و فلسفہ کے ساتھ فقہ و حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

دہلی میں قیام کے دوران مرزا غالب سے ملاقات کی اور انھیں اپنی غزلیں دکھاتے تھے اس طور پر حالی کو غالب کی شاگردی کا شرف ملا۔ جب بھی دہلی جاتے غالب کی صحبت سے فیض اٹھاتے تھے۔ حالی کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے بھی ہوئی تو ان سے دوستی ہو گئی اور ان کے بچوں کو پڑھانے کے لیے جہاں گیر آباد چلے گئے۔ یہاں کچھ اطمینان و سکون کے گزارے۔ نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی لاہور چلے گئے یہاں انھیں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی اردو کتابوں کی عبارتوں کو درست کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح حالی کو انگریزی ادب سے قریب ہونے کا موقع ملا۔ چار سال تک یہ کام بخوبی انجام دیتے رہے اسی دوران محمد حسین آزاد کے جدید خیالات سے متاثر ہو کر چار نظمیں بعنوان

’برکھارت‘، ’نشاطِ امید‘، ’مناظرہِ رحم و انصاف‘ اور ’حبِ وطن‘ لکھیں۔ یہ نظمیں عام روایت سے ہٹ کر تھیں اس لیے ان نظموں سے اردو میں جدید رجحانات کی شروعات ہوئی۔

اسی دور میں مولانا حالی نے سرسید سے ملاقات کی اور انھوں نے علی گڑھ تحریک میں اپنا تعاون پیش کیا۔ حالی سرسید کے رفقا میں شمار ہونے لگے۔ سرسید کے اصرار پر انھوں نے ’مسدس مدوجزرا سلام‘ تصنیف کی جو سرسید کو بہت پسند آئی اس نظم کے ذریعہ حالی نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم اردو کی مقبول ترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ مولانا حالی نے ۱۸۹۳ء میں جب اپنا دیوان شائع کرایا تو اس میں مقدمہ پیش کیا جس میں اردو شاعری اور اس کی جملہ اصناف پر اپنے قیمتی مشورے اور تنقیدی نظریات پیش کیے جو اردو میں اس سے پہلے ان خیالات کو اس طرح پیش نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ بعد میں اس مقدمہ کو ’مقدمہ شعرو شاعری‘ کے نام سے جانا گیا اور جس کو اردو تنقید کی پہلی کتاب بھی تسلیم کیا گیا۔

مولانا حالی نے فارسی کے مشہور ادیب اور شاعر شیخ سعدی کی سوانح حیات ’حیاتِ سعدی‘ کے نام سے لکھ کر اردو میں سوانح نگاری کی بنیاد رکھی بعد میں انھوں نے اپنے فاضل استاد مرزا غالب کی سوانح ’یادگارِ غالب‘ اور سرسید کی سوانح ’حیاتِ جاوید‘ لکھیں جو اردو سوانح نگاری میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ حالی کی دیگر تصنیفات میں سوانحِ عمری مولانا عبدالرحمن (استادِ حالی) مضمینِ حالی ۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۱ء وغیرہ ہیں اس کے علاوہ ان کی نظموں میں ’چپ کی داد‘، ’مناجاتِ بیوہ‘، ’شکوہِ ہند‘ اور دیگر چھوٹی بڑی نظموں کے علاوہ قطعات، رباعیات، مثنویاں اور قصائد وغیرہ بھی لکھے ہیں، ان کے قصائد تکلف اور بے جا مبالغہ سے پاک ہیں۔ مولانا حالی نے ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

مولانا حالی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے انھوں نے نظم و نثر دونوں میدانوں میں اپنی مہارت اور قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ غزل گو کی حیثیت سے ان کا ایک دیوان یادگار ہے ان کی غزلوں

میں قدیم اور جدید دونوں طرح کے خیالات کی آمیزش ہے۔ ان کی غزلوں میں دل سوزی اور جذبات کی گرمی کے ساتھ حق پرستی، پند و نصیحت اور مشاہداتِ زندگی کے عناصر موجود ہیں وہ بات کو بڑی سادگی سے کہنے کے قائل ہیں۔

نظم نگاری کی حیثیت سے مولانا حالی ایک کامیاب شاعر ہیں وہ مقصدی شاعری کے پیش رو ہیں ان کی نظموں میں پُچپ کی داد، مناجات بیوہ، عورتوں کی حالت زار پر کہی گئی نظمیں ہیں جو سوز و گداز سے لبریز ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں کو ہر فارم میں آزمایا ہے حالی کی شاعری خیالات کی بلندی، تشبیہات، استعارات، تصنیع، رعایتِ لفظی وغیرہ سے پاک ہے، وہ شاعرانہ استدلال کو مقصدیت پر قربان کر دیتے ہیں اسی لیے ان کے کلام میں شاعرانہ جوش کم ہی نظر آتا ہے۔

نصاب میں شامل ”مرثیہ غالب“ مولانا حالی کا بہترین کارنامہ ہے مرزا غالب جو حالی کے استاد اور بہت اچھے رفیق تھے اور مولانا حالی جن کی شخصیت اور شاعری کے پرستار تھے ۱۸۶۹ء میں جب غالب کی وفات ہوئی تو انھیں ان کی موت پر گہرا صدمہ ہوا اور انھوں نے اپنے رنج و غم کا اظہار مرثیہ غالب کی شکل میں کیا۔ حالی نے اس مرثیہ میں اپنے استاد سے والہانہ محبت کا اظہار بڑے جوش و عقیدت کے ساتھ کیا ہے غالب کی موت پر کہا گیا یہ مرثیہ ان کے قلبی واردات کی ترجمانی کرتا ہے حقیقت نگاری، اثر انگیزی کے لحاظ سے یہ اردو کے چند نمائندہ اور منتخب شخصی مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی

مرثیہ غالب

(۱)

کیا کہوں حال دردِ پنهانی
عیشِ دنیا سے دل ہو گیا سرد
کچھ نہیں جز طلسمِ خواب و خیال
بحرِ ہستی بجز سراب نہیں

وقت کوتاہ قصہ طولانی
دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی
گوشہٴ فقر و بزمِ سلطان
چشمہٴ زندگی میں آب نہیں

(۲)

بلبل ہند مرگیا ہیہات
نکتہ داں ، نکتہ سنج ، نکتہ شناس
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں

جس کی تھی بات بات میں اک بات
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مرگئی دلی!!
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

خواجہ نوشاہ تھا اور شہرِ برات
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات
شہر میں ایک چراغ تھا ، نہ رہا

(۳)

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس سے دادِ سخنوری پائیں
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
اہلِ میّت جنازہ ٹھہرائیں !!

(۴)

نثر، حسن و جمال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر
چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے
دیکھ لو آج، پھر نہ دیکھو گے
نظم، غنچِ زلال کی صورت
تعزیت اک ملال کی صورت
انورسی و کمال کی صورت
غالبِ بے مثال کی صورت

(۵)

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
بارِ احباب جو اٹھاتا تھا
تھی ہر اک بات نیشتر جس کی
دلِ مضطر کو، کون دے تسکین
اپنا بیگانہ اشک بار ہے آج
دوشِ احباب پر سوار ہے آج
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج
ماتمِ یارِ نمگسار ہے آج
ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج
کس سے خالی ہوا جہاں آباد
غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد

(۶)

کیا ہے جس میں وہ مردِ کار نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہو
خاکساروں سے خاکساری تھی
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے
مرگیا قدر دانِ فہم و سخن
تھا بساطِ سخن یہ اک شاطر
شعر میں نا تمام ہے حالی
اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا
جان دینے پہ اختیار نہ تھا
سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
جا کے دلّی سے آئے گا اب کون
شعر ہم کو سنائے گا اب کون
ہم کو چالیں بتائے گا اب کون
غزل اس کی بنائے گا اب کون

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	لفظ
پوشیدہ درد، چھپا ہوا درد	در وِ پنهان
فنا ہونے والی دنیا	عالمِ فانی
جادو کا تماشا	طلسم خواب و خیال
شاہی محفل	بزمِ سلطانی
سوائے، بغیر	بجز
ہندوستان کا بلبل، مراد شاعر (غالب)	بلبلِ ہند
بات کی باریکی کو سمجھنے والا	نکتہ داں
ذہین، دانا	نکتہ شناس
ظریف، خوش طبع	ٹھٹھول
عالی فہم، ذہین	روشن دماغ
تصحیح، درستی، نظرِ ثانی	اصلاح
جنازے کے ساتھ جانے والے	اہلِ میت
مبارک بادی	تہنیت
دل اداس ہونا	دل سرد ہونا
درویش کا کونہ	گوشہٴ فقر
سمندر (مراد دنیا)	بحرِ ہستی

دھوکہ فریب	سراب
افسوس	ہیہات
چچی تلی بات کہنے والا، سخن شناس	نکتہ سنج
تحفہ داد سخن وری شاعری پرداد پانا شاعری کی پرکھ	سوغات
پاکیزہ غنچہ (کلی)	غنچ زلال
خوشی، مسرت	نشاط
دونوں فارسی کی بلند پایہ شاعر ہیں	انوری و کمال
نوک دار اوزار، تیر	نیشتر
بے چین	مضطرب
وہ شخص جو ہر کام کو خوش اسلوبی سے انجام دے	مرد کار
عجز، عاجزی	انکساری
پھیلاؤ چادر، شطرنج	بساط
شطرنج کا ماہر	شاطر
زمانے کی آنکھ	چشمِ دوراں
غمگین، رنجیدہ	سوگوار
زخمی مجروح	فگار
ناخوش	ناشاد
موافق، لائق	سازگار
شان و شوکت والے لوگ (یہاں مراد مغرور)	سر بلند

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ حالی نے عربی کی تعلیم کس سے حاصل کی تھی؟
- ۲۔ حالی کے والد کا کیا نام تھا؟
- ۳۔ حالی نے کس سن میں وفات پائی؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ حالی کی دو مشہور نظموں کے نام لکھیے۔
- ۵۔ حالی نے کس کا مرثیہ لکھا ہے؟ اور ان کا حالی سے کیا رشتہ تھا؟
- ۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی لکھیے۔
درِ پہناں - نکتہ داں - تہنیت - سوغات

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ مولانا حالی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
- ۸۔ 'مرثیہ غالب' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

نظم: ایک تعارف

یوں تو ہر کلام موزوں نظم کے دائرے میں آتا ہے۔ لیکن نظم بہ حیثیت صنف اپنی الگ اور انفرادی پہچان رکھتی ہے۔ نظم کے معنی ”موتی پرونے“ یا ”لڑی میں پرونا“ بتائے جاتے ہیں۔ نظم کا اپنے لغوی اور اصطلاحی معنوں سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جس طرح ایک ایک موتی پرو کر مالا بنائی جاتی ہے ٹھیک اسی طرح شاعر اپنے خیالات کی ایک ایک کڑی کو الگ الگ مصرعوں کے ربط و تسلسل کے ساتھ موزوں کرتا ہے تب نظم تخلیق پا کر وجود میں آتی ہے۔ اس بابت پروفیسر سید احتشام حسین کا یہ بیان بھی قابل لحاظ ہے کہ ”جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اُس سے مراد اشعار کا ایسا مجموعہ ہے جس میں مرکزی خیال اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس پیدا ہو سکے۔ اس کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں اور نہ اس کی ہیئت ہی معین ہے۔“

غزل کی طرح نظم کے موضوعات میں بھی بلا کی وسعت ہوتی ہے۔ زندگی اور کائنات کا ایسا کوئی پہلو نہیں جو نظم کے زمرہ کار میں نہ آتا ہو۔ غزل کے بعد نظم ہی ایسی صنف سخن ہے جو معروف و مقبول ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے نظم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”نظم کی مثال ایک ایسے دریا کی سی ہے جس میں طرح طرح کے

نشیب و فراز ہیں، کہیں وہ چٹانوں کا سینہ چیر کر نکلتا ہے تو کہیں

میدانوں میں متانت اور وقار کے ساتھ بہتا ہے لیکن دریا میں ایک

تسلسل اور ایک وحدت ہوتی ہے۔“

ہدیت کے لحاظ سے نظم کی مندرجہ ذیل اقسام کا چلن اردو میں چلا آ رہا ہے:

۱۔ پابند نظم :

وہ نظم جس میں کسی خاص بحر اور قافیوں کی پابندی ضروری ہو، اُسے پابند نظم کہتے ہیں۔ اس قسم کی نظم میں غزل کی طرح برابر کے مصرعوں کا التزام ضروری ہوتا ہے۔

۲۔ نظم مُعَرَّی :

نظم مُعَرَّی کا دوسرا نام نظم عاری بھی ہے۔ نظم کی یہ قسم انگریزی ادب کی ”بلینک ورس“ سے مشتق ہے۔ جس میں قافیہ کی پابندی تو نہیں ہوتی لیکن ہر مصرعہ برابر اور مساوی الوزن ہونا لازمی ہوتا ہے۔

۳۔ آزاد نظم :

نظم کی یہ قسم بھی انگریزی کی ”فری ورس“ سے مشتق ہے۔ اس میں ردیف اور قافیہ کی پابندی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے۔ اور متعلقہ بحر کے ارکان بھی گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔

۴۔ نثری نظم :

آزاد نظم کی طرح نثری نظم بھی چھوٹی بڑی نثری سطور پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں ردیف، قافیہ، بحر اور وزن کی پابندی نہیں ہوتی۔ بعض حضرات نے نثری نظم کو ”نثر“ کا نام بھی دیا ہے جسے ادبی حلقوں میں قبول نہیں کیا گیا۔

نظم نگاری کی ابتداء یوں تو محمد قلی قطب شاہ مآئی اور دکن کے بعض دوسرے شاعروں کی بہاریہ نظموں سے ہوئی۔ لیکن نظیر اکبر آبادی وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے نظم نگاری کو رواج بخشا۔ ان کی عوامی موضوعات پر لکھی منظومات نے نظم نگاری کی روایت کو مضبوط کیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد اردو نظم نگاری کا ارتقاء تیزی سے ہونے لگا۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد

نے ”بزم مناظمہ“ کی بنیاد ڈالی تو اردو نظم کو آگے بڑھنے کے خاطر خواہ مواقع فراہم ہوئے۔ حالی نے مُقَدِّمہ شعر و شاعری کے توسط سے شعرائے اردو سے جدید طرز کی نظمیں لکھنے کا مطالبہ کیا جس پر کئی شاعروں نے لبیک کہا۔ پہلی نعمانی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، سرور جہان آبادی، نظم طباطبائی، مولانا اسماعیل میرٹھی، جوش ملیح آبادی اور چکبست لکھنوی جیسے شعراء نے میدان نظم گوئی میں قابل قدر اضافے کیے۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں نے تو صنف غزل پر نظم گوئی کو ترجیح دیتے ہوئے خوب سے خوب تر نظمیں تخلیق کیں۔ اس ذیل میں ن۔م۔م۔ راشد، میراجی، احسان دانش، اختر شیرانی، مجاز لکھنوی، مخدوم محی الدین، مجروح سلطان پوری، وامق جوہنوری، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، سکندر علی وجد، غلام ربانی تاباں اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے صنف نظم کو بام عروج پر پہنچانے کی حتی الامکان کوشش کی۔

عہد حاضر میں جن شعرائے کرام نے نظم نگاری کے ذریعہ اپنی فکر رسا کے گھوڑے دوڑائے ان میں نذافاضلی، شمس الرحمن فاروقی، عمیق حنفی، بیکل اتساہی، پروفیسر شہریار، پروفیسر عتیق اللہ اور زبیر رضوی وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ نظم نگاری کا کارواں ہنوز رواں دواں ہے جو اس صنف کے روشن مستقبل کی دلیل ہے۔

نظیر اکبر آبادی

شیخ ولی محمد نام، نظیر تخلص۔ ۱۷۴۰ء کے قریب دہلی میں پیدا ہوئے۔ نظیر کے والد کا نام شیخ محمد فاروق تھا جن کا انتقال نظیر کی کم عمری میں ہو گیا تھا۔ چونکہ نظیر اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اس لیے ان کی تعلیم و تربیت بڑے لاڈ پیار سے ہوئی۔ یوں تو نظیر اردو، فارسی اور عربی زبانیں جانتے تھے لیکن پنجابی، مارواڑی، ہندی اور پوربی زبانیں بھی سمجھ لیتے تھے۔ جب دہلی پر احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا تو نظیر اپنی والدہ کے ساتھ آگرہ چلے آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ آگرہ سے اپنی نسبت پر نظیر ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ نظیر نے درس و تدریس کو ترجیح دیتے ہوئے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ انھیں خوش نویسی میں بھی دل چسپی تھی اس لیے انھیں ’ہفت قلم‘ کے نام سے شہرت ملی۔ دیگر علوم و فنون مثلاً طب، نجوم، منطق، معانی بیانی اور موسیقی سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ ورزش اور سپہ گری میں بھی دخل رکھتے تھے، غرض یہ کہ نظیر کثیر المعلومات اور ہمہ داں شخص تھے۔

نظیر کے مزاج میں انکساری، خوش اخلاقی، انسان دوستی، شوخی و ظرافت، رنگینی و بذلہ سنجی اور وسیع المشرقی جیسے اعلیٰ اوصاف موجود تھے۔ نظیر کی زندگی عسرت اور غربتی میں بسر ہوئی۔ نوے برس کی عمر میں ان پر فالج کا حملہ ہونے کے سبب وہ چار پانچ برس تک بیمار رہے اور بالآخر ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء کو ان کا انتقال ہوا۔

نظیر اردو شاعری میں ’’عوامی شاعر‘‘ کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے ان موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے جن کی طرف ان سے قبل کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ بعض اہل علم نے ان کے اس قدم کو جائز نہیں مانتے ہوئے ان کے کلام کو سوقیانہ قرار دے کر اس کی اہمیت سے انکار کیا

ہے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ نظیر وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شاعری کا رشتہ انسانی زندگی سے جوڑنے کی کوشش کی۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ انہوں نے ”آدمی نامہ“، ”ہولی نامہ“، ”بنجارہ نامہ“، ”دیوالی“، ”شب برأت“، ”مفلسی“، ”بالپن بانسری بچیا“، ”کلجگ“، ”روٹیاں“ اور ”خوشامد“ جیسی نظمیں تخلیق کر کے اپنے قومی فریضے کو انجام دیا۔

نظم ’روضہ تاج گنج‘ نظیر کی تہذیبی و ثقافتی نظموں میں شمار ہوتی ہے اس نظم میں انہوں نے محبت کی یادگار اور دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہونے والے ’تاج محل‘ کے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا مظاہرہ کیا ہے۔ نظیر کا یہ نظریہ ہے کہ یہ خوبصورت عمارت دھن و دولت کے بجائے ایثار و محبت کے جذبہ پر قائم ہے۔ اس عمارت میں لگے پتھروں کے دل بھی محبت کی حرارت سے دھڑکتے ہیں۔ قابل تعریف ہیں وہ معمار جنہوں نے اسے بنانے میں جاں فشانی سے کام لیا ہے۔ یہاں کے باغ اور دالان دلوں کا دامن کھینچتے ہیں۔ جو نقش و نگار مصوروں نے قلم سے بتائے ہیں انہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے گویا وہ مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ یہاں باد نسیم ایسے چلتی ہے جیسے یہ گلشن فردوس کی کھڑکی سے آرہی ہو۔ بادشاہ شاہجہاں کا یہ شاہکار ہمیشہ ہندوستان کے لیے باعث افتخار تسلیم کیا جائے گا۔

روضہ تاج گنج

یارو! جو تاج گنج یہاں آشکار ہے مشہور اس کا نام بہ شہر و دیار ہے
خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے روضہ جو اس مکان میں دریا کنار ہے
نقشے میں اپنے یہ بھی عجب خوش نگار ہے
روئے زمیں پہ یوں تو مکاں خوب ہیں یہاں پر اس مکاں کی خوبیاں کیا کیا کروں بیاں
سنگ سفید سے جو بنا ہے قمر نشاں ایسا چمک رہا ہے تجلی سے یہ مکاں
جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے
گنبد میں اس کا زور بلندی سے بہرہ مند گرد اس کے گنبدیاں بھی چمکتی ہوئی ہیں چند
اور وہ کلس جو ہے سر گنبد سے سر بلند ایسا ہلال اس پہ سنہرا ہے دل پسند
ہر ماہ جس کے خم پہ مہ نو نثار ہے
ہیں بیچ میں مکاں کے وہ دو مرقدیں جو بیاں گرد اُن کے جالی اور مچھر ہے درفشائیں
سنگین گل جو اس میں بنائے ہیں تہ نشاں پتے، کلی، سہاگ رگ رنگ ہے عیاں
جو نقش اس میں ہے وہ جواہر نگار ہے
دیواروں پر جو سنگ ہے نازک عجب نگار آئینے بھی لگے ہیں مچلی و تاب دار
دروازے پر لکھا ہے خط طغرا طرفہ کار ہر گوشے پر کھڑے ہیں جو مینار اس کے چار
چاروں طرف سے اوج کی خوبی دو چار ہے

جو صحن باغ کا ہے وہ ایسا ہے دل کشا آتی ہے جس میں گلشنِ فردوس کی ہوا
ہر سونسیم چلتی ہے اور ہر طرف ہوا ہلتی ہیں ڈالیاں سبھی ہر گل ہے جھومتا

نوارے چھٹ رہے ہیں رواں جوئے بار ہے

وہ تاجدار شاہجہاں صاحبِ سریر بنوایا ہے انھوں نے لگا سیم و زر کثیر
جو دیکھتا ہے اُس کے یہ ہوتا ہے دل پذیر تعریف اس مکان کی میں کیا کروں نظیر

اس کی صفت تو مشتمل روزگار ہے

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
فضیلت دینا، بہتر سمجھنا، فوقیت دینا	ترجیح دینا
بچوں کو پڑھانے کا پیشہ، مدرسے	معلمی
ہنسی مذاق، خوش طبعی	بذلہ سنجی
دور تک پھیلا ہوا، کشادہ، فراخ	وسیع المشربی
بازاری، عوام کی پسند کا، مبتذل	سوقیانہ
وہ شخص جس میں بزرگوں، فقیروں اور خدا رسید لوگوں	درویش صفت
جیسی خوبیاں ہوں	
خوش اخلاق، شائستگی، صفائی	تہذیب
تہذیب، کلچر، نیک ہونے کی دلیل	ثقافت
بناوٹی، نقلی، جعلی، جو قدرتی نہ ہو	مصنوعی
جس پر فخر و ناز کیا جائے	باعث افتخار
وہ مقبرہ جس پر گنبد بنا ہو	روضہ
ظاہر، نمایاں، کھلا ہوا، واضح	آشکار
ملک، علاقہ، نگر، بڑی آبادی	شہر و دیار
تکیہ، بھروسہ، اعتماد، یقین	اعتبار

کنار	بغل، آغوش، گود، سینہ
خوش نگار	اچھا لگنے والا، خوش رقم بہترین کاتب
روئے زمین	زمین کی سطح
سنگ سفید	سفید پتھر، سنگ مرمر
قمر نشاں	چاند کی طرح حسین و خوبصورت
تجلی	تابانی، روشنی، چمک
بلور	ایک چمکدار اور شفاف معرنی جوہر
گنبد	برج، گول چھت، عمارت کا بالائی حصہ جو گول ہوتا ہے
بہرہ مند	صاحبِ قسمت، خوش نصیب
کلس	گنبد کے اوپر کانوک دار حصہ جو چمکیلا ہوتا ہے
سر بلند	معزز، عالی مرتبہ، ممتاز، سرفراز
ہلال	مہینے کا پہلا چاند
ماہ	مہینہ
مہِ نو	ہلال، مہینے کا پہلا چاند
نثار	صدقے، قربان، نچھاور
مرقدیں	آرام گاہیں، قبریں، مزارات
گرد	آس پاس، قریب، ارد گرد
حجر	جالی دار
دُرفشاں	چمک دار، تابناک، خوش نما

بھاری پتھر پر کشیدہ کاری کرنا	سنگین گل
وہ سونے اور جواہرات کا کام جو تلوار کے قبضے پر ہوتا ہے	تہہ نشاں
ایک قسم کا عطر یا خوشبو	سہاگ
جسم کی وہ نلیاں جن میں خون رہتا ہے	رگ رنگ
ظاہر، نمودار، کھلا ہوا	عمیاں
صورت، شبیہ، مورت، تصویر	نقش
مرصع، جڑاؤ، خوشخط، خوبصورت لکھنے والا	جواہر نگار
جس کی تحریر سب سے جدا اور منفرد ہو	عجب نگار
تاباں، روشن، چمک دار، تجلی نما	مجلی و تابدار
عربی رسم الخط میں پیچیدہ مگرفن کارانہ اور خوبصورت تحریر	خط طغرا
نادرا اور انوکھا کام کرنے والا	طرفہ کار
کوئہ، خلوت، تنہائی	گوشے
اونچائی، بلندی، رفعت، عروج	اوج
آنگن، انگنائی	صحن
دل کو خوش کرنے والا، دل شگفتہ کرنے والا	دل کشاں
جنت کا باغ، جنت کی پھلواری	گلشن فردوس
ہر طرف، ہر جگہ	ہر سو
صبح کی ٹھنڈی ہوا	نسیم
ایک ایسی بڑی نہر جس میں بہت سی نہریں آکر مل جاتی ہیں	جوئے بار

نہروں کا خطہ	تاجدار
بادشاہ، صاحبِ تاج، تاج والا	صاحب سریر
تحت شاہی یا گدی و مسند کا مالک	سیم وزر
چاندی اور سونا	کثیر
بہت، زیادہ، بے شمار، افراط سے	دل پذیر
مرغوب، پسندیدہ	صفت
وصف، خوبی، خاصیت	مشہر
مشہور کیا گیا، شہرت دیا گیا	روزگار
زمانہ، گزارا، قسمت، موقع محل	

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ 'روضہ' کسے کہتے ہیں؟
- ۲۔ 'جوئے بار' کسے کہتے ہیں؟
- ۳۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم 'روضہ تاج گنج' کے علاوہ دو نظموں کے عنوانات لکھیے۔

مختصر سوالات:

- ۴۔ مندرجہ ذیل کے متضاد الفاظ لکھیے۔
قمر۔ مصنوعی۔ مہ۔ اوج۔
- ۵۔ لفظ 'فردوس' کے مترادف الفاظ لکھیے۔
- ۶۔ 'روضہ تاج گنج' کہاں ہے اور کس پتھر سے بنا ہوا ہے؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ نظم 'روضہ تاج گنج' کا خلاصہ لکھیے۔
- ۸۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعرانہ خصوصیات تحریر کیجیے۔

خواجہ الطاف حسین حالی

خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ حالی کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش انصاری تھا۔ جب حالی محض نو برس کے تھے تب ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، لہذا حالی کے بڑے بھائی امداد حسین اور بہن نے ان کی پرورش اور تعلیم کی ذمہ داری اٹھائی۔ حالی بلا کے ذہین اور محنتی تھے۔ بچپن میں ہی قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد انھوں نے پانی پت میں ہی تھوڑی سی فارسی سید جعفر علی سے اور عربی حاجی ابراہیم حسین سے پڑھی۔ سترہ برس کی عمر میں ان کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کر دی گئی، اس لیے پوشیدہ طور پر وہ دہلی چلے آئے، اور مولوی نوازش علی سے عربی کی تعلیم مکمل کی اور منطق کے ساتھ علم عروض بھی سیکھا۔ اسی زمانے میں حالی کی مرزا اسد اللہ خاں غالب اور نواب غلام مصطفیٰ خاں شیفتہ سے شناسائی ہوئی۔ تقریباً آٹھ برس تک حالی، شیفتہ کے بچوں کے معلم رہے۔ شیفتہ کی صحبتوں نے ان کے ذوق شعر گوئی اور ملکہ شعر فہمی کو چمکا دیا لیکن حالی نے مرزا غالب کی شاگردی قبول کی۔

۱۸۵۷ء میں حالی نے اپنے وطن پانی پت لوٹ کر ملازمتی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر آپ ۱۸۷۲ء میں گورنمنٹ بک ڈپولاہور میں ملازمت کرنے لگے، یہاں آپ نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کی عبارت درست کرنے کا کام کیا۔ لاہور میں حالی نے مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کر 'انجمن پنجاب' کے مشاعروں میں جدید اردو نظم کے بنیاد گزار کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۸۷۴ء میں حالی لاہور سے دہلی چلے آئے اور اینگلو عربک کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ انھیں دنوں انھوں نے سر سید احمد خاں کی فرمائش پر 'مسد مد و جزر اسلام' تخلیق کر کے میدان شاعری میں انقلاب برپا کر دیا۔ سر

سید کی سفارش پر جب حالی کو سرکاری وظیفہ ملنے لگا تو انھوں نے ملازمت سے کنارہ کشی کرتے ہوئے علمی و ادبی امور میں آزادانہ طور پر دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ۱۹۱۳ء میں حالی کو ”شمس العلماء“ کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو بمقام دہلی ستر برس کی عمر میں حالی کا انتقال ہوا۔

حالی نے نثر و نظم میں یکساں طور پر ادبی خدمات انجام دیں۔ نثر میں ’حیات سعدی‘ (۱۸۸۶ء)، ’حیات جاوید‘ (۱۸۹۴ء) اور ’یادگار غالب‘ (۱۹۰۱ء) اُن کی بہترین سوانح عمریاں ہیں۔ اس کے علاوہ ’مقدمہ شعر و شاعری‘ اور ’مقالاتِ حالی‘ بھی قابلِ تحسین نثری کارناموں میں شامل ہیں۔

حالی نے بہ حیثیت شاعر بھی کامیابی حاصل کی۔ یوں تو انھوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، ترجیح بند، ترکیب بند اور قطعہ گوئی میں طبع آزمائی کی لیکن اپنی شاہ کار شعری تخلیق ’مسدس مد و جزر اسلام‘ (۱۸۹۳ء) کے ذریعہ انھیں دائمی شہرت ملی۔ جدید نظم گوئی کی حیثیت سے حالی کا مقام مسلم ہے۔ انھوں نے جدید مضامین و موضوعات اور منفرد اسلوب بیان سے اردو کا دائرہ وسیع کیا۔ مبالغہ آرائی اور تصنع سے ان کا کلام پاک صاف ہے۔ بیان کی ندرت اور زبان کی سلاست ان کا طرہ امتیاز ہے۔ حالی کی مشہور اور کامیاب نظموں میں ’برکھارت‘، ’چپ کی داد‘، ’مناجاتِ بیوہ‘، ’نشاطِ امید‘، ’ظہورِ رحمت‘، ’خود ستائی‘ اور ’تعصب اور انصاف‘ وغیرہ شامل ہیں۔

نظم ’جدید ترقیات‘ بھی حالی کی مذکورہ منظومات کی طرح نمائندہ نظم ہے۔ اس نظم کے توسط سے حالی نے یہ پیغام دیا ہے کہ یہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے لہذا اس دور میں وہی کامیاب و کامران ہو سکتا ہے جو سائنسی علوم و فنون سے واقف ہو۔ اس لیے ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ سائنسی علوم و فنون میں مہارت حاصل کریں تاکہ ہماری قوم کا شمار بھی ترقی یافتہ اقوام میں ہو سکے۔

جدید ترقیات

اے عزیزو! میں بھی ہوں آخر بنی نوع بشر
غل ہے کیا نوع بشر میں کچھ تمہیں بھی ہے خبر
کر رہا ہے خاک کا پتلا وہ جو ہر آشکار
ہو رہی ہے جس سے شانِ کبریائی جلوہ گر
رفتہ رفتہ یہ غبارِ ناتواں پہنچا ہے واں
طائرِ وہم و تصور کے جہاں جلتے ہیں پر
اس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخر کر کیا
ابرو برق و باد سے تا بحر و بر و دشت و در
حق نے آدم کو خلافت اپنی جو کی تھی عطا
دے رہے ہیں اس خلافت پر گواہی بحر و بر
تھا ارسطو اور افلاطون کو بہت کچھ جن پہ ناز
ہو گئے تقویم پارینہ وہ سب علم و ہنر
کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہے آج
بڑھ رہا ہے دم بدم یوں آج کل علم بشر
قوتِ ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور
شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر

ساز و ساماں جونہ تھے کل بادشاہوں کے نصیب
کوڑیوں کے مول سے پھرتے ہیں وہ در بدر
کہتے ہیں مغرب سے ہوگا جب برآمد آفتاب
عرصہ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
دوستو! شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب
آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی نظر
رَو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دستکاری کو مٹاتی صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
علم دلیل، علم مناظرہ، ٹھیک طور سے سوچنے کا علم	منطق
وہ علم جس سے نظم کے قواعد معلوم ہوتے ہیں	علم عروض
درست، بجا، ٹھیک، تسلیم کیا گیا، مانا گیا	مُسَلَّم
خوبی، عمدگی، انوکھی بات	طَّرَہ امتیاز
ذریعہ، وسیلہ	توسط
نئی، نیا، تازہ، اب کا	جدید
ترقی کا جمع بمعنی آگے بڑھنا، اونچا ہونا، بلندی، برتری	ترقیات
بشر، انسان، انسان کی اولاد	بنی نوع
آدمی، انسان، منش	بشر
شور، ہنگامہ	غل
خوبی، خاصیت، لیاقت، استعداد	جوہر
ظاہر، نمایاں، کھلا ہوا، واضح	آشکار
اللہ کی عظمت، شوکت، دبدبہ، توقیر	شان کبریائی
خاص بناؤ سنگھاریا سچ دھج کے ساتھ نمودار ہونا	جلوہ گر
آہستہ آہستہ، ہولے ہولے، بتدریج	رفتہ رفتہ

معمولی گرد اور مٹی کے مانند	غبار ناتواں
تصور و خیال کا پرندہ	طائر وہم و تصور
تسخیر کیا گیا، بالغ کیا گیا، قبضہ کیا گیا، فتح کیا گیا	مسخر
بادل، گھٹا، بدلی	ابر
بجلی، صاعقہ	برق
ہوا، باؤ، پون	باد
تک، تاکہ، جب تک	تا
تری اور خشکی، تمام دنیا، سمندر اور زمین	بحر و بر
جنگل، صحرا، بیابان، شطرنج کا تختہ	دشت و در
سچ، صدق، لائق، واجب، اللہ تعالیٰ	حق
نیابت، اللہ والے کی جانشینی، خلیفہ کا عہدہ	خلافت
یونان کا مشہور عالم جو فلسفے کا معلم اول کہلاتا ہے۔	ارسطو
وہ سکندر کا استاد اور مشیر تھا	
یونان کے ایک بہت بڑے حکیم کا نام جو بقراط کا شاگرد	افلاطون
اور ارسطو کا استاد تھا	
فخر، غمزه، عزت، بڑائی	ناز
پرانی جنتری، بے کار چیز، نکمی چیز	تقویم پارینہ
دانش مندی، دانائی، آگاہی، فنکاری	علم و ہنر
تحقیق کی جمع بمعنی دریافت کرنا کھوج لگانا	تحقیقات

ہر گھڑی، ہر وقت، برابر، متواتر، پے در پے	دم بدم
وہ علم جو بنی نوع انسان کی دسترس میں ہو	علم بشر
ایجاد کرنے کی طاقت یا قدرت	قوت ایجاد
صبح، فجر، بڑکا	سحر
اسباب، ضروری چیزیں، آلات، بندوبست	ساز و سامان
سورج، خورشید، مہر	آفتاب
دھار، جوش، ولولہ، پانی کا بہاؤ	رَو
تہ و بالا، درہم برہم، الٹ پلٹ، تباہ	زیروزبر
ہنر، کاریگری، ہاتھ کا کام	دستکاری
صنعت کی جمع بمعنی کاریگری، دستکاری	صنعتوں
دانش مندی، دانائی، ہنر مندی، آگاہی، فنکاری	علم و حکمت
غفلت کرنے والے، بے پروا، بے خبر لوگ	غافلوں

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ ”جدید“ کسے کہتے ہیں؟
- ۲۔ حالی کس عظیم شاعر کے شاگرد تھے؟
- ۳۔ حالی کس شاعر کے بچوں کو پڑھاتے تھے؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ لفظ ”ابرو“ کے مترادف الفاظ لکھیے۔
- ۵۔ حالی کی نثری کتابوں کے نام لکھیے۔
- ۶۔ حالی کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ ارسطو اور افلاطون کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
- ۸۔ نظم ”جدید ترقیات“ کا خلاصہ لکھیے۔

علامہ اقبال

شیخ محمد اقبال نام اور اقبال تخلص۔ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو پنجاب کے مشہور شہر سیالکوٹ میں ولادت پائی۔ اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد اور والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ ان کے بزرگوں کا سلسلہ سپر ڈگوت کے کشمیری پنڈتوں سے ملتا ہے۔ جو بعد میں حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

اقبال نے ابتدائی تعلیم اسکول مشن اسکول میں داخل ہو کر مولوی میر حسن شاہ سے حاصل کی تھی۔ ۱۸۹۳ء میں انٹر کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۷ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۹۹ء میں فلسفے میں ایم اے کیا اس دوران انہیں فلسفے کے مشہور پروفیسر مسٹر آرنلڈ سے بھی فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔

اقبال پہلے اورینٹل کالج لاہور اور اس کے بعد گورنمنٹ لالہ لاہور میں انگریزی اور فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اقبال یورپ گئے۔ آپ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفے میں پی ایچ۔ ڈی۔ اور لندن سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر ۱۹۰۸ء میں ہندوستان لوٹے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ چونکہ وکالت کا پیشہ ان کی طبیعت کے مطابق نہیں تھا اس لیے وکالت ترک کر دی۔ حکومت برطانیہ نے انہیں ۱۹۲۳ء میں ”سر“ کے معزز خطاب سے نوازا۔ اس کے علاوہ انہیں ’شاعر مشرق‘ اور ’رومی عصر‘ جیسے خطابات سے بھی جانا جاتا ہے۔

اقبال نے تین شادیاں کی تھیں مگر ان کی شادی شدہ زندگی مختلف مسائل میں گزری۔ چونکہ اقبال دل کے مریض تھے اس لیے ان کی صحت مسلسل خراب ہوتی گئی اور آخر کار ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو بمقام لاہور آپ نے انتقال فرمایا۔

اقبال کی شاعری کا آغاز روایتی انداز کی غزل گوئی سے ہوا تھا۔ لیکن جلد ہی ان کی توجہ قومی و وطنی شاعری کی طرف ہو گئی۔ اقبال نے مولوی میر حسن شاہ اور داغ دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ ان کی شاعری فکر و عمل، بلند ہمتی، یقین کامل، حب الوطنی، قومی یکجہتی اور انسان دوستی کا پیغام دیتی ہے۔ اردو میں اقبال کی شاعری کے چار مجموعے بعنوان 'بانگِ درا'، 'بالِ جبریل'، 'ضربِ کلیم' اور 'ارمغانِ حجاز' شائع کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی مشہور نظموں میں 'حضرِ راہ'، 'طلوعِ اسلام'، 'لینن خدا کے حضور میں'، 'شکوہ'، 'جوابِ شکوہ'، 'فرشتوں کا گیت'، 'ساقی نامہ' اور 'مسجدِ قرطبہ' وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

نظم 'شُعاعِ اُمید' اقبال نے اپنے انتقال سے دو برس قبل ۱۹۳۶ء میں تخلیق کی تھی۔ یہ نظم ان کے شعری مجموعے 'ضربِ کلیم' کی نمائندہ نظموں میں مخصوص مقام رکھتی ہے۔ یہ نظم تمثیلی انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں سورج اور شعاع کا مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ سورج اپنی شعاعوں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ تم اس دنیا سے آسمان میں لوٹ آؤ کیونکہ دنیا کے لوگ بیدار نہیں ہیں۔ لیکن ایک شوخ اور چنچل کرن سورج سے یہ کہتی ہے کہ میں تب تک ہندوستان کی تاریک فضا کو نہیں چھوڑوں گی جب تک کہ خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار نہ کر دوں۔ یہ نظم ہندوستانیوں کو مایوسی اور نا اُمیدی سے نکال کر حوصلہ مندی اور بیداری کا پیغام دیتی ہے۔

شُعَاعِ اُمِّید

(۱)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام
مدّت سے تم آوارہ ہو پنہائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہری ایام
نے ریت کے زروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثل صباطوف گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلّی کدہ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستاں و بیابان و در و بام

(۲)

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذت نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش

پھر ہم کو اسی سینہ روشن میں چھپالے
اے مہر جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہ حور
آرام سے فارغ صفت جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہراک زرہ جہاں تاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی اُمیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خرف ریزہ دُر تاب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لیے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانہ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلمان تہہ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حزر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
امید کی کرن	شُعاعِ اُمید
بے مقصد بھٹکنے والا	آوارہ
فضا کی وسعت	پنہائے فضا
زمانے کی ناموافقیت، بے توجہی، تقدیر کی گردش	بے مہری ایام
آرام	راحت
مشرقی ہوا کی طرح	مثل صبا
طواف۔ آس پاس چکر لگانا	طوف
کونہ	گوشہ
جلوہ گاہ، روشنی کا جگہ	تجلی کدہ
جنگل	بیابان
آبادی (دروازے اور چھت)	دروہام
آسمان۔ دنیا	آفاق
ملنا۔ ملنے والی	ہم آغوش
مغربی تہذیب پر چلنے والے	مغرب
یورپ۔ انگریز	افرنگ

سیہ پوش	کالا لباس پہننے والے (تاریک)
مشرق	مشرقی تہذیب کے ماننے والے
لذت انتظار	دیدار کی لذت
عالمِ لاہوت	فنائی اللہ کا مقام۔ تصوف میں وہ درجہ جو سالک کو حاصل ہوتا ہے
مہر جہاں تاب	سورج دنیا کو روشن کرنے والا (عالم بالا)
فرا موش	نظر انداز
جوہر	اصل فطرت
سیماب	پارہ ایک دھات۔ جو ایک جگہ پر نہیں ٹھہرتی
رخصت تنویر	روشن کرنے کی اجازت
مردانِ گراں خواب	گہری نیند میں سوئے ہوئے لوگ
خاور	مشرق
پروین	ثریا، جھمکا، وہ سات ستارے جو پاس پاس رہتے ہیں
خذف ریزہ	ٹھیکری کا ٹکڑا
دُر تاب	سچا موتی
غواصِ معانی	حقیقت کی تہہ تک پہنچنے والے عالم
غواص	غوطہ خور
بحر	سمندر
پر آشوب	ہنگاموں اور مصیبتوں سے گھرا ہوا
پایاب	تہہ میں بیٹھنے والا

مراد خاموش، مضراب جس سے باجا بجایا جاتا ہے	بیگانہ مضراب
مسجد میں پیش امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کے نیچے	تہہ محراب
ناخوش، بد دل	بیزار
پرہیز	حذر
اضافہ، بیشی، بڑھوتری	مزید
عزت دار، بڑا، با وقعت	معزز
تعریف کے طور پر اچھا نام	خطاب
ہوشیاری، عقل، سمجھ، دانائی	بیداری

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- (۱) ”شُعَاعُ اُمید“ کے کیا معنی ہیں؟
- (۲) لفظ ”مہرِ عالمِ تاب“ کے معنی بتائیے۔
- (۳) ”عالمِ لاہوت“ سے اقبال کی کیا مراد ہے؟

مختصر سوالات:

- (۴) اقبال کے دو شعری مجموعوں کے عنوانات لکھیے۔
- (۵) اقبال کو کن کن القاب سے یاد کیا جاتا ہے؟
- (۶) ”شُعَاعُ اُمید“ کے علاوہ اقبال کی دو نظموں کے نام لکھیے۔

تفصیلی سوالات:

- (۷) نظم ”شُعَاعُ اُمید“ کا خلاصہ لکھیے۔
- (۸) اقبال کی سوانح لکھتے ہوئے ان کے کلام کی چند خصوصیات بیان کیجیے۔

برج نرائن چکبست

برج نرائن نام، خاندانی لقب ”چکبست“، تخلص کچھ نہیں۔ اس سلسلے میں خود فرماتے ہیں:

ذکر کیوں آئے گا بزمِ شعر میں اپنا
میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

اس کے باوجود انھوں نے اپنے خاندانی لقب ”چکبست“ کو اپنے کلام میں جگہ جگہ تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے۔ چکبست کی ولادت ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد ہوئی۔ آپ کے اہل خاندان کشمیری برہمن تھے۔ آپ کے والد کا نام اُدت نرائن چکبست تھا جو یقیناً تخلص فرماتے تھے۔ چکبست کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے کنگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے۔ پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں قانون کی ڈگری حاصل کر کے وکالت شروع کی۔ اپنی قابلیت و صلاحیت کی وجہ سے آپ لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمے کے سلسلے میں آپ رائے بریلی سے لکھنؤ لوٹ رہے تھے تب ریلوے اسٹیشن پر آپ فالج کا شکار ہو گئے۔ زبان بند ہو گئی اور چند گھنٹوں میں آپ آنجمانی ہو گئے۔

چکبست نے غزل گوئی سے اپنی شاعری کی ابتداء کی تھی۔ چونکہ آپ نے اساتذہ کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا تاہم آپ کے کلام پر میر، غالب، انیس اور آتش وغیرہ کے کلام کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ چکبست نے اردو نظم نگاری کے دامن کو اپنی وسعتوں سے مالا

مال کیا۔ آپ نے قومی یکجہتی، وطن پرستی، ذہنی بیداری اور اصلاحِ معاشرت جیسے موضوعات پر خصوصی توجہ صرف کی۔ مناظرِ قدرت کی عکاسی میں چکبست کو مہارت حاصل تھی۔ زبان نہایت صاف اور انداز بیان دلکش تھا۔ آپ کا مجموعہٴ کلام ”صبحِ وطن“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ علاوہ ازیں ”صبحِ امید“ نامی ایک رسالہ نکال کر آپ نے اردو صحافت کی تاریخ میں بھی اپنا نام درج کروایا۔

چکبست کی مشہور نظموں میں ’آوازہٴ قوم‘، ’سیرِ دہرہٴ دون‘، ’خاکِ وطن‘ اور ’گوکھلے کا مرثیہ‘ اہم ہیں۔ نظم ’راما میں کا ایک سین‘ میں چکبست نے اپنے مذہبی عقائد کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے اس نظم کے حوالے سے یہ واضح کیا ہے کہ رام چندر جی اپنے ماں باپ کے فرماں بردار بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنے والد راجا دشرتھ جی کے حکم کی تعمیل میں شاہی ٹھاٹ باٹ چھوڑ کر ’بن باس‘ کو پسند کیا۔ یہ نظم رام چندر جی کا مثالی کردار (آدرش روپ) پیش کرتی ہے چکبست کے دل گداز انداز نے نظم کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ الفاظ کی چُست بندش اور خیالات کی پاکیزگی نے اس نظم کو متاثر کن بنا دیا ہے۔

رامائن کا ایک سین

(انتخاب)

(رام چند رچی اپنی ماں سے اجازت طلب کرنے جا رہے ہیں)

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا اہتمام دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی
دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نو نہال خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے
کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ نورِ نظر پہ دیدہ حسرت سے کی نگاہ
جُنبش ہوئی لبوں کو، بھری ایک سرد آہ لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رُخ کی راہ
چہرے کا رنگِ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر مومے تنِ زباں کی طرح بولنے لگا
روکر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں

سب کو خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
 کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
 جو گی بنا کے راج دُلا رے کو بھیج دوں
 لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
 ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم تم میرے لال تھے، مجھے کس سلطنت سے کم
 میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
 تم ہی نہیں تو آگ لگا دوں گی راج کو
 کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نو نہال
 پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
 چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
 کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے
 سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریادِ درد خیز اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
 عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
 سوچا یہی کہ جان سے بے کس گزر نہ جائے
 ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے
 پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
 صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دُور
 شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
 کچھ مصلحت اسی میں ہو پرور دگار کی

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب جس سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوزِ دُروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب پیری مٹی کسی کی کسی کا لٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے
پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہ گار یہ جانتے نہیں وہ ہیں دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے، امرِ رضا میں جو ختم رہے
اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام بعدِ سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرتے میں چودہ برس تمام قائم امید ہی سے ہے، دُنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں
اپنی نگاہ ہے کرمِ کار ساز پر صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرِ باں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اُس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت، دامنِ مادر سے کم نہیں

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
بہتری، لیاقت، سمجھ	صلاحیت
جو مر کر دوسری دنیا میں چلا جائے	آنجہانی
کُشا دگی، چوڑائی، پھیلاؤ، گنجائش	وسعت
عقیدہ کی جمع بمعنی یقین، ایمان، اعتبار	عقائد
دل کو نرم کرنے والا	دل گداز
اجازت، منظوری، وداع، روانگی، کوچ	رخصت
وفاداری کا راستہ	راہِ وفا
گل، سب، مکمل، خاتمہ	تمام
دیدار، کسی مقدس مقام کا نظارہ	زیارت
انتظام، بندوبست، سرانجام کرنا	اہتمام
سخن، بات چیت، گفتگو	کلام
ظاہر کرنا یا ہونا، کھولنا، بیان	اظہار
لا چاری، عاجزی، بے مددگاری	بے کسی
ظلم، آزار، ایذا، زیادتی	ستم
کم عمر یا کم سن بچہ	نونہال

معاملہ، کیفیت، ظاہری رونداد	صورتِ خیال
دل شکستہ، رنجیدہ، ناخوش، غم گین	خستہ حال
تخیّر یا تعجب کی حالت، حیرت خاموشی	سکتہ
رنج و غم کی سختی یا کثرت	شدّتِ ملال
آدمی، انسان، منش	بشر
پیلا، سنہری	زرد
پتھر کی صورت	تصویرِ سنگ
بے قصور، بے خطا، بے جرم	بے گناہ
آنکھوں کی روشنی، کنایتاً بیٹا	نورِ نظر
حسرت بھری نگاہ	دیدہ حسرت
حرکت، گردش، ہلنا	جنبش
ٹھنڈی سانس بھرنا، افسوس کرنا	سرد آہ
آنکھوں کے کونے	گوشہ ہائے چشم
چہرہ، صورت	رُخ
جسم کے بال، رونگٹے، رُو ان	مُوئے تن
دیرانہ، بیابان، ریگستان	صحرا
جاری، بہتا ہوا، تیز	رواں
کبھی نہیں	ہرگز
جنگل، صحرا، بیابان، ریگستان	بن

ہندو فقیر، پجاری، جو دنیا کو ترک کر دے	جوگی
شہزادہ، راج کمار	راج ڈلارا
حاصل ہونا، میسر آنا، مہیا ہونا	بہم
شان، شکوہ، دبدبہ، مرتبہ، رتبہ	شوکت و حشم
بادشاہی، حکومت، عمل داری	سلطنت
سخت محنت و مشقت	ریاضتوں
سال اور مہینے	ماہ و سال
موقع محل، نیک ساعت، صحیح وقت	جوگ
درد پیدا کرنے والا، درد انگیز	درد خیز
زخمی، گھائل، بد حال	خستہ جاں
تیز تلوار، تیز شمشیر	تیغ تیز
رونا، آنسو برسانا	اشک ریز
صبر و تحمل، پی جانا، جذب کرنا	ضبط
بھاگنا، پرہیز کرنا، اجتناب کرنا	گریز
رنجیدہ، غمگین، بد قسمت، نامراد	ناشاد
ماں، والدہ	مادر
رنج، غم، دکھ	الم
افراط، بہتات، زیادتی، کثرت	وفور
رنج، غم، دکھ، الم	صدمہ

دشوار، دو بھر، ناگوار	شاق
ضعیفی کا دور، بزرگی کا زمانہ	عالم پیری
پت جھڑ، فصل خریف، بے رونقی	خزاں
ظاہر، نمودار، کھلا ہوا	عیان
نیک صلاح، اچھا مشورہ، مناسب تجویز	مصلحت
تغیّر و تبدل، گردش، دور، نیرنگ زمانہ	انقلاب
قلبی سوز و درد، اندرونی دکھ	سوزِ دُروں
دل، جان، کلیجہ	قلب و جگر
غم، رنج، آزر دگی، ناخوشی	رنج و محن
خالق، خدائے تعالیٰ	کردگار
وقت، زمانہ یاد و رکوع جاننے والا (نظم میں خدا سے مراد ہے)	دانائے روزگار
مستقل مزاج، ارادے کا مضبوط، عہد کا پکا	ثابت قدم
جھکا ہوا، ٹیڑھا	خم
بامراد، کامیاب، خوشحال	شاد کام
دکھ، درد، غم، تکلیف	رنج و بلا
بھاگنا، فرار ہونا	مفر
ایک جگہ قیام، پڑاؤ، اقامت	حضر
جنگل کا دامن یا آنچل، گوشہٴ دشت	دامانِ دشت
ماں کا دامن یا آنچل	دامانِ مادر

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ ”رخصت“ کے کیا معنی ہوتے ہیں؟
- ۲۔ رام چندرجی کس کا نام لے کر اپنے والد سے رخصت ہوئے؟
- ۳۔ ”نورِ نظر“ کسے کہتے ہیں؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ لفظ ’عیان‘ اور ’اہتمام‘ کے مترادف الفاظ لکھیے۔
- ۵۔ نظم ’رامائن‘ کا ایک سین کے آخری بند کا مطلب لکھیے۔
- ۶۔ ’کیا جانے کس خیال میں تھی گم وہ بے گناہ‘ اس مصرعے کی وضاحت کیجیے۔

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ نظم ’رامائن‘ کا ایک سین کے ابتدائی دو بندوں کی تشریح کیجیے۔
- ۸۔ چکبست کی سوانح عمری لکھتے ہوئے ان کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

قائل اجمیری

عبدالرحیم نام، قائل تخلص۔ ۲۷ اگست ۱۹۳۱ء کو بمقام قصبہ چرلی، ضلع اجمیر (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے۔ قائل کے والد کا نام عبدالکریم تھا جو اجمیر میں مکانوں کی ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے۔ چونکہ قائل بچپن ہی میں اپنے والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے اس لیے ان کی تعلیم، تربیت اور پرورش دادا دادی کی زیر نگرانی ہوئی۔ قائل نے اپنی تعلیم دارالعلوم معینہ عثمانیہ، درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی، اجمیر میں حاصل کی۔ قائل اپنے اساتذہ کے محبوب شاگرد تھے۔ حکیم محمد جمیل دہلوی نے قائل کی تعلیم میں دلچسپی دیکھ کر خوب حوصلہ افزائی کی۔ قائل نے قرآن مجید مکمل کرنے کے بعد صرف و نحو کی تعلیم کے ساتھ ساتھ شیخ سعدی کی 'گلستاں' اور 'بوستاں' پڑھی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر قائل نے کچھ دنوں عرضی نویسی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔

قائل کو ابتدائی عمر سے شعر و شاعری کا شوق تھا اس لیے انہوں نے ابتداً ایک مشہور شاعر صوفی عبدالرحیم ارمان کے حلقہ تلامذہ میں جگہ بنائی۔ کچھ عرصے بعد قائل نے استاد سخن مولانا خواجہ عبدالباری معنی اجمیری کی شاگردی قبول کی۔ معنی اجمیری کی نگرانی میں قائل عمدہ شعر کہنے لگے۔ کئی نقادوں نے قائل کو راجستھان کا روایت شکن شاعر قرار دیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد قائل نے بادل ناخواستہ حیدرآباد سندھ (پاکستان) کو اپنا مسکن بنایا۔ چونکہ قائل تپ دق کی مریض تھے اس لیے یہ خاندانی مرض ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ ایک نرس، جنہوں نے قائل کی تیمارداری کی تھی، ان کی اہلیہ بن گئیں اور بیگم نرگس کے نام سے یاد کی جانے لگیں۔ نرگس صاحبہ نے اگرچہ قائل کی خوب دیکھ بھال کی لیکن ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو قائل نے حیدرآباد سندھ (پاکستان)

میں انتقال کیا۔

قابل کو ادب کے ساتھ ساتھ صحافت کا بھی شوق تھا تاہم انھوں نے مولانا ماہر القادری کے رسالے 'فاران' کی صحافتی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی اور مخدوم محمد یوسف کے تعاون سے ایک ہفت روزہ پرچہ 'شاہین' جاری کیا۔ علاوہ ازیں روزنامہ 'جاوید' اور 'آفتاب' سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ قابل کی تخلیقات ان دونوں اخبارات میں متواتر شائع ہوتی تھیں۔

قابل کے سوا شعرا کا ایک مختصر ترین مجموعہ بعنوان 'قابل کے سوشلر، جگر مراد آبادی کی تحریر کے ساتھ شائع ہوا۔ قابل کے انتقال کے بعد ان کی بیگم نرگس قابل نے قابل کے دوست محسن بھوپالی کی کوششوں سے قابل کی پہلی برسی کے موقع پر ۱۹۶۳ء میں ان کا مجموعہ 'کلام دیدہ بیدار' اپنے ذاتی خرچ سے شائع کرایا۔ اس کے بعد ۱۹۶۶ء میں ان کا دوسرا مجموعہ 'کلام خونِ رگ جاں' منظر عام پر آیا۔ ۱۹۹۲ء میں متحدہ عرب امارات سے 'کلیات قابل' کی اشاعت عمل میں آئی۔ قابل کے صاحب زادے ظفر قابل موقع بہ موقع قابل کا غیر مطبوعہ کلام منظر عام پر لاتے رہتے ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں انھوں نے قابل کا ایک شعری مجموعہ 'عشق انسان کی ضرورت ہے' شائع کروایا جس میں قابل کی نمائندہ غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔

قابل کے تلامذہ کی فہرست بہت مختصر ہے جس میں عبداللطیف رند اور عبدالرحمن مسرور صدیقی جیسے شاعروں کے نام شامل ہیں۔ قابل نے اگرچہ غزلوں کے مقابلے نظمیں کم کہی ہیں لیکن ان کی نظمیں اپنی مثال آپ ہونے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی مشہور اور کامیاب نظموں میں 'چاندنی رات'، 'امروز'، 'جہان نو' اور 'رفیقانِ اجمیر' کے نام کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قابل کو غزل گوئی کی طرح نظم نگاری میں بھی قدرت حاصل تھی۔

بقول پروفیسر ارشد رضا:

”قابل کی شاعری میں زندگی کی تلخیاں اور نفسیات کی باریکیاں
ایسی سموائی ہوئی ہیں جس طرح ایک کامل مصور مختلف رنگوں کے
مزانج اور خطوط کی کشیدگی سے ایک ایسی تصویر بناتا ہے کہ دیکھنے
والے پر سحر کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔“

قابل کی نظم ’بیادِ اجمیر‘ مادر وطن سے ان کی محبت و عقیدت کی مثال پیش کرتی ہے۔ جیسا کہ بیان
کیا جا چکا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد قابل کو بادلِ ناخواستہ اجمیر سے ہجرت کرنی پڑی تھی، لیکن وہ تادمِ حیات
اجمیر اور اہل اجمیر کو نہیں بھولے۔ خواجہ کا آستانہ، جھالرے کا پانی اور بچپن کا یار جانی یاد آنے پر قابل زار و
قطار اشک بار ہوتے تھے۔ یہ نظم نہیں بلکہ قابل کی فریاد ہے۔ اس نظم اور اختر شیرانی کی نظم ’اودیس سے
آنے والے بتا‘ میں بہت مماثلت ہے۔

بیادِ اجمیر

جب ابرِ مست چھایا پیغامِ یار لایا
جب پھول مسکرایا کول نے گیت گایا
اجمیر یاد آیا
بلبل نے جب پکارا اک تیر دل پہ مارا
جذبات کو ابھارا غم کا غبار چھایا
اجمیر یاد آیا
راتوں کی خامشی میں تاروں کی روشنی میں
شفاف چاندنی میں دل نے سکوں نہ پایا
اجمیر یاد آیا
فکرِ چمن نہ پوچھو یادِ وطن نہ پوچھو
دیوانہ پن نہ پوچھو اکثر فریب کھایا
اجمیر یاد آیا
خواجہ کا آستانہ دربارِ خسروانہ

وہ کیف وہ ترانہ کچھ بھی نہ ساتھ لایا
اجمیر یاد آیا
وہ جھالے کا پانی آبِ بقا کا ثانی
بچپن کا یار جانی اب ہو گیا پرایا
اجمیر یاد آیا
معنیٰ سا آہ رہبر ہائے نیازت و اطہرت
اب کیا کہیں کہ دل پر کس کس کا داغ کھایا
اجمیر یاد آیا

۳، ۲، ۱: شعرائے اجمیر

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

معانی	الفاظ
پرانے طور طریقوں یا چلن کو توڑ کر نئی راہ نکالنے والا	روایت شکن
وطن کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا	ہجرت
قانونی اجازت سے عرضیاں لکھنے والا	عرضی نویسی
ہمت بڑھانا، شاباش دینا	حوصلہ افزائی
شاگردوں کی مجلس یا جماعت	حلقہ تلامذہ
وہ علم جس میں لفظوں کا جوڑ توڑ اور ان کے بولنے، برتنے کا قاعدہ	صرف و نحو
بیان کیا جاتا ہے	
کڑواہٹ، سختی، تیزی، ترشی	تلخیاں
جادو، طلسم	سحر
حالت، عالم اور رنگ کا چھانا یا غلبہ ہونا	کیفیت طاری ہونا
دل سے نہیں چاہتے ہوئے بھی	بادل ناخواستہ
تاعمر، زندگی بھر، زندہ رہنے تک	تادم حیات
اشک باری کرنا، بہت رونا	زار و قطار
مستی بھرا بادل	ابر مست
پیام، سندیسہ، خبر پہنچانا	پیغام

جذبہ کی جمع بمعنی جوش، ولولہ، کشش	جذبات
گرد، دھول، خاک، ملال، آزر دگی	غبار
نہایت صاف، جس میں آر پار نظر آئے	شفاف
دغا، مکر، دھوکا، جھانسنہ، شعبدہ	فریب
بزرگ کا مزار، چوکھٹ، روضہ مبارک کا دروازہ	آستانہ
شاہانہ، بادشاہانہ، بادشاہی طریقے والا	خسروانہ
نشہ، خمار، سرور	کیف
نغمہ، راگ، گیت	ترانہ
آبِ حیات، امرت، جل	آبِ بقا
مقابلہ، مانند، ہم پلہ، ہم سر	ثانی

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ نظم ”بیادِ جمیر“ کے شاعر کا نام کیا ہے؟
- ۲۔ قابلِ اجمیری نے کس کے دربار کو خسروانہ بتایا ہے؟
- ۳۔ قابلِ اجمیری کے مطابق کس کا پانی آبِ بقا کا ثانی ہے؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ نظم ”بیادِ جمیر“ میں اجمیر کے کن کن شاعروں کے نام آئے ہیں؟
- ۵۔ ”حُثَّاف چاندنی“ سے قابلِ اجمیری کی کیا مراد ہے؟
- ۶۔ قابلِ اجمیری کی تاریخِ ولادت و وفات مع مقام تحریر کیجیے۔

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ نظم ”بیادِ جمیر“ کا خلاصہ لکھیے۔
- ۸۔ قابلِ اجمیری کی سوانح اور خصوصیاتِ کلام پر روشنی ڈالیے۔

سرٲٲ مطالعه

اردو زبان کی پیدائش: مختلف نظریات

ہندوستان مشترکہ تہذیبوں اور بولیوں کا گھر ہے۔ اس وسیع و عریض ملک میں مختلف رسم و رواج کے ماننے والے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ یہاں کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج، طور طریق علاقائی سطح پر بدلتے رہتے ہیں اس طرح مختلف علاقوں میں الگ الگ بولیاں بولی جاتی تھیں۔ انھیں علاقائی اور باہر سے آئی ہوئی زبانوں کے میل جول سے ایک مخلوط زبان نے جنم لیا جسے ہم اردو کے نام سے جانتے ہیں۔

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں اردو سرزمین ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی۔ یہ زبان سندھ، پنجاب، دہلی، دکن اور آس پاس کی زبانوں کا اثر قبول کرتی ہوئی سارے ہندوستان میں پھیلی، مختلف ادوار میں اس کو مختلف ناموں سے جانا گیا۔ ہندوستان کی نسبت سے اسے ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ حضرت امیر خسرو نے اسے ہندی اور ہندوی کہا ہے۔ اس کے علاوہ اسے اردوئے معلیٰ، زبانِ دہلوی، ریختہ اور ہندوستانی ناموں سے جانا گیا۔

اردو زبان کی ابتدا کے متعلق مختلف محققین نے تاریخی حقائق کی روشنی میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد، مختلف مقامات پر ان کا قیام، وہاں کی زبانوں کے اثرات، اردو زبان کی تشکیل میں ان سب کا بڑا اہم رول رہا۔

سید سلیمان ندوی کا نظریہ:

سید سلیمان ندوی اپنی کتاب، 'نقوشِ سلیمانی' میں لکھتے ہیں۔ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں۔ اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا، ہیولی اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔'

چونکہ مسلمان پہلی بار محمد بن قاسم کی قیادت میں ہندوستان میں داخل ہوئے اور محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ پر حملہ کیا۔ اور راجا داہر کو شکست دے کر سندھ کو مسلم حکومت کا ایک صوبہ بنا لیا اور قریب یہاں تین سو سال حکومت کی۔ محمد بن قاسم کے لشکر میں عربی بولنے والے لوگ تھے۔ ان کی زبان سندھ کی زبان سے متاثر ہوئی اور دونوں زبانوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا اور جس کے نتیجے میں مقامی بولی اور عربی کی آمیزش شروع ہوئی اور اس طرح ایک نئی زبان پیدا ہوئی۔

محمود شیرانی کا نظریہ:

محمود شیرانی نے اپنی تصنیف ”پنجاب میں اردو“ میں اس بات پر زور دیا کہ اردو کی جائے پیدائش پنجاب ہے اس کی دلیل میں انھوں نے دونوں زبانوں کے صرف و نحو، تذکیر و تانیث جمع و واحد کے طریقے میں مماثلت کا ہونا بتایا۔

چونکہ محمد بن قاسم کے بعد محمود غزنوی نے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر حملے کرنے شروع کئے۔ دھیرے دھیرے مسلمان سارے پنجاب میں پھیل گئے۔ ان لوگوں کی زبان فارسی اور ترکی تھی۔ ان لوگوں اور مقامی لوگوں کے آپسی میل جول سے یہ زبان وجود میں آئی۔ محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ ”اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔“

محمد حسین آزاد کا نظریہ:

اردو زبان کی ابتدا سے متعلق محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب ”آب حیات“ میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ ”اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور

برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔“ اس نظریہ کو علمی حلقوں نے اس زمانے میں قبول کیا اور برج بھاشا کو عام طور پر اردو کی ماں سمجھا جانے لگا۔ اس نظریہ کو محمد حسین آزاد سے پہلے میرامن، سرسید احمد خاں اور امام بخش صہبائی بھی پیش کر چکے تھے۔ چونکہ برج بھاشا دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی تھی اور وہاں اس زبان کو خاص مرتبہ حاصل تھا اس لیے آزاد نے اردو اور برج کے رشتے پر زور دیا ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نظریہ:

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تصنیف ”داستان زبان اردو“ میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو کھڑی بولی سے ترقی پا کر بنی ہے جو دہلی اور میرٹھ کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اور پروفیسر گیان چند جین بھی کھڑی بولی کو اردو کی اصل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ”اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے، کھڑی بولی دہلی اور مغربی یوپی کی بولی ہے۔“

پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ:

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی تصنیف ”مقدمہ تاریخ زبان اردو“ میں دہلی اور اس کے پاس بولی جانے والی بولیوں کی طرف توجہ دلائی۔ ان کے نزدیک ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا اور میواتی دہلی کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھیں ان کے مطابق ”نواح دہلی کی یہ بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں۔“

غرض اردو زبان کی ابتدا کے مختلف نظریات کے پیش نظر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو وہ عربی، فارسی، ترکی زبان بولتے ہوئے آئے اور سندھ میں قریب تین سو سال سکونت اختیار کی تو وہاں کی زبان کے اثرات قبول کیے پھر پنجاب میں محمود غزنوی کی قیادت میں دو سو سال قیام کیا تو پنجابی زبان کے قریب ہو گئے جب دلی پایہ تخت بنا تو کھڑی بولی، برج بھاشا، ہریانی

اور میواتی زبانوں کا اثر قبول کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے اردو نے نہ صرف عربی و فارسی بلکہ سنسکرت، انگریزی اور سینکڑوں مقامی زبانوں کے الفاظ قبول کیے ہیں۔ اس طرح اردو زبان نے موجودہ شکل اختیار کی۔

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۲۔ اردو کس زبان کا لفظ ہے؟
- ۲۔ ”پنجاب میں اردو“ کے مصنف کا نام تحریر کیجیے۔
- ۳۔ مسلمان پہلی بار کس کی قیادت میں سندھ میں داخل ہوئے؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ اردو زبان کی پیدائش کے متعلق محمد حسین آزاد نے کون سا نظریہ پیش کیا؟
- ۵۔ دہلی کے آس پاس کون سی زبانیں بولی جاتی تھیں؟
- ۶۔ حضرت امیر خسرو نے اردو کو کن ناموں سے پکارا ہے؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ اردو زبان کی ابتدا سے متعلق مختلف نظریات پر روشنی ڈالیے۔
- ۸۔ اردو زبان کے آغاز اور ارتقا کا جائزہ پیش کیجیے۔

ڈاکٹر قائد علی خاں

دبستانِ دہلی

اردو شعر و ادب میں دبستانِ دہلی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دہلی کے شعراء اپنا ایک خاص شاعرانہ مزاج اور طرزِ فکر رکھتے ہیں جس میں اس عہد کی دہلی کی تہذیب و تمدن اقتصادی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کا عکس نظر آتا ہے۔ شہرِ دہلی لمبے عرصے تک ہندوستان کا پایہ تخت رہا اور اہل حکومت کی سرپرستی اور شعراءِ نوازی کے سبب وہاں بڑی تعداد میں شاعر، ادیب اور اہل ہنر جمع ہو گئے۔ جس کے سبب دہلی نے ایک باقاعدہ ادبی اسکول کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس ادبی اسکول کو دبستانِ دہلی کہا جاتا ہے۔

دہلی میں باقاعدگی کے ساتھ اردو زبان میں شعر و شاعری کا سلسلہ اورنگ زیب کے آخری زمانے میں ولی کے دکن سے دہلی آنے کے بعد شروع ہوا۔ اورنگ زیب کے زمانے تک شمالی ہند میں اردو زبان صرف بول چال کی حد تک محدود تھی اور فارسی زبان کو ہی علمی و ادبی حیثیت حاصل تھی، ولی کی آمد کے بعد شعرا نے اردو میں شعر و شاعری کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی۔ ان شعراء میں خان آرزو، آبرو، شاکر ناجی، تاباں، یک رنگ، مضمون، شاہ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میر، سودا اور درد کا زمانہ اردو شاعری کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس زمانے میں فنی اعتبار سے بعض اصناف کی انتہائی ترقی ہوئی جیسے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں کوئی شاعر ایسا نہیں ملتا جس نے غزل نہ کہی ہو چنانچہ اس دور میں میر اور درد کی غزلیں اور سودا کے قصیدے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غزل اور قصیدے کے ساتھ ہی میر نے مثنوی کے صنف پر بھی طبع آزمائی کی، سودا نے اردو مرثیے کو نیا قالب اور فکر و انداز عطا کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دلی تباہ و برباد ہو رہی تھی چاروں طرف انتشار اور افراتفری کا زمانہ تھا، سماجی، معاشی اور معاشرتی بد حالی کا دور دورہ تھا، یہ وہ ناسازگار حالات تھے جس کے سبب دہلی کے نامور شعرا ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ میر تقی میر، سودا، سوز، انشاء، مصحفی، جرأت اور رنکین وغیرہ نے دہلی کو خیر باد کہا اور لکھنؤ پہنچے۔ جہاں انہیں شاہان لکھنؤ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں ایک بار پھر دبستان دہلی پر بہار آئی، بہادر شاہ ظفر کو شعر و سخن سے ذاتی دلچسپی تھی، انہوں نے پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لی بعد میں ذوق کو اپنا استاد بنایا، بہادر شاہ ظفر نے ذوق کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا۔ اس عہد کے شعرا میں شاہ نصیر، ذوق، مومن اور غالب کا نام قابل ذکر ہے۔ اس دور کے سب سے نمایاں شاعر مرزا غالب ہیں۔ انہوں نے غزل، قصیدے، مثنویاں، قطعات اور مرثیے بھی کہے ہیں لیکن غالب کو عظمت غزل گو شاعر کی حیثیت سے ملی۔ ذوق نے اپنا زور تخیل قصیدے میں دکھایا اور مومن کی شخصیت غزل میں انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔

دہلی کے شعرا اپنے دلی جذبات و احساسات کی ترجمانی بڑے سیدھے سادے اور دل نشیں انداز میں کرتے ہیں، ان کا کلام تصنع و بناوٹ سے پاک ہے۔ شاعری میں داخلیت ہے جو دہلوی اسکول کی نمایاں خوبی ہے۔ غزل میں حسن و عشق کے موضوعات کثرت سے استعمال کیے لیکن ان میں پاک خیالات اور روحانیت پائی جاتی ہے۔

اخلاق و تصوف کے مضامین بھی دہلی کے شعرا نے خوب قلم بند کیے ہیں چونکہ دہلی صوفیا کا مرکز رہی ہے بعض شاعر خود بھی صوفی تھے جیسے خواجہ میر درد لیکن جو شاعر صوفی نہیں تھے انہوں نے بھی اپنی شاعری میں صوفیانہ خیالات کو پیش کیا۔ اس کا سبب دہلی کے وہ حالات تھے جس نے شعرا کے مزاج میں دنیا کی ناپائیداری اور خوف خدا کے جذبات و احساسات پیدا کر دیے تھے۔ طبیعت میں صبر و قناعت اور استغنیٰ ہونے کی وجہ سے دہلوی شعرا کے کلام میں حق گوئی اور حق پسندی کے جذبات ملتے ہیں اور سوز و

گداز غزل کی جان ہے۔ دہلوی شعرا کا طرز بیان سادہ اور فطری ہے۔ جدید معنی خیز تراکیب، لطیف استعارے اور نادر تشبیہات کا استعمال بھی ملتا ہے، روز مرہ اور محاورہ کی چاشنی ہے، کلام میں درد و اثر پایا جاتا ہے۔

دبستانِ دہلی کو اس کی شاعرانہ عظمت اور خصوصیات کے بنا پر دبستانِ لکھنؤ پر فوقیت حاصل ہے۔ یہاں کے شعرا نے اپنے کمالاتِ فن کا مظاہرہ اس انداز میں کیا ہے کہ اردو شاعری کو دنیا کے شعرو سخن میں ایک الگ پہچان ملی۔

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ دبستانِ دہلی کے کسی ایک ممتاز شاعر کا نام لکھیے۔
- ۲۔ سودا کو کس صنف میں امتیاز حاصل ہے؟
- ۳۔ بہادر شاہ ظفر نے کس کو اپنا استاد بنایا تھا؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ بہادر شاہ ظفر نے ذوق کو کس خطاب سے نوازا تھا؟
- ۵۔ مرزا غالب نے کون کون سی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی؟
- ۶۔ دبستانِ دہلی کے وہ کون سے شعرا تھے جنہوں نے دہلی کو خیر باد کہا؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ دبستانِ دہلی کی شاعرانہ خصوصیات واضح کیجیے۔
- ۸۔ دہلی کے حالات نے اردو شعراء کو کس طرح متاثر کیا وضاحت کیجیے۔

ڈاکٹر قاسم علی خاں

دبستان لکھنؤ

لکھنؤی شاعری اپنے عہد کی ملکی، سیاسی اور معاشرتی حالات کی عکاسی کرتی ہے، جب دلی کی بساط پلٹی تو وہ مغل بادشاہ شاہ عالم کا زمانہ تھا، چاروں طرف انتشار اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ سماجی، معاشی اور معاشرتی بد حالی کا دور دورہ تھا۔ یہ وہ ناسازگار حالات تھے جس کے سبب دہلی کے نامور شعراء ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ ادھر لکھنؤ میں دولت کی فراوانی، عیش و عشرت اور امن و امان تھا۔ بادشاہ وقت خود شاعر تھے اور شاعروں کے قدردان بھی تھے۔ ان کے دربار علم و فن اور شعر و سخن کے مرکز تھے چنانچہ نواب شجاع الدولہ سے نواب واجد علی شاہ کے زمانے تک لکھنؤ میں شعر و سخن کا اس طرح فروغ ہوا کہ دہلی کے مقابلے میں لکھنؤ کی ایک انفرادیت نظر آنے لگی جس کو دبستان لکھنؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دہلی کے وہ شعرا جو دہلی سے فیض آباد اور لکھنؤ پہنچے ان میں میرضا حاک، میرسوز، سودا، میر حسن وغیرہ تھے جو شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد گئے۔ میر تقی میر، انشا، مصحفی، جرأت آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ پہنچے صرف دردا ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے دہلی کو خیر باد نہیں کہا۔

لکھنؤ میں شعر و شاعری کا سلسلہ ان شعرا کی بدولت شروع ہوا جن کی شاعری کا آغاز تو دہلی میں ہو چکا تھا اور لکھنؤ پہنچ کر انھیں عروج حاصل ہوا۔ بزرگ دہلوی شعرا نے اپنی روایات کو قائم رکھا لیکن نوجوان شعرا کے کلام میں نئی فکر، نئے اسالیب، نیالہب و لہجہ، نئے محاورے، نئی بندشیں اور ترکیبیں سامنے آئیں۔ یہ سب وہاں کے تمدن اور خوشحالی کے زیر اثر منظر عام پر آئیں۔ یہیں سے دبستان لکھنؤ کا آغاز ہوا۔

دبستان لکھنؤ کا باقاعدہ آغاز انشا، مصحفی کے زمانے سے ہوتا ہے لیکن ان کے یہاں دہلوی

اثرات اتنے غالب رہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری کو خالص لکھنوی رنگِ سخن کا نمونہ نہیں کہا جاسکتا، البتہ مشکل زمینوں کا استعمال، معاملہ بندی کے اشعار اور ریختی کا اثر ضرور دیکھا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ناسخ اور آتش کے دور میں لکھنوی رنگِ سخن انتہائی عروج پر پہنچا۔ امام بخش ناسخ و دبستان لکھنؤ کے سب سے نمائندہ شاعر ہیں۔ آپ نے زبان کی اصلاح کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ شاعری کے نئے اصول و ضوابط مقرر کئے۔ ناسخ کے شاگردوں میں علی اوسط رشک، بحر، وزیر، منیر، برق وغیرہ شامل ہیں۔ آتش، مصحفی کے شاگرد تھے۔ ان کی غزلوں میں بندشِ الفاظ، اور مرصع سازی کا ہنر نظر آتا ہے۔ آتش کے شاگردوں میں پنڈت دیانکر نسیم، رند، صبا، شوق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ لکھنؤ کی عیش و عشرت کی زندگی، بے فکری اور دولت کی فروانی نے شعر و ادب کو بھی متاثر کیا۔ لکھنوی شعرا کے کلام میں سطحی مضامین، معاملہ بندی، محبوب کے زلف و رخ، خدو خال اور کنگھی چوٹی کا ذکر ہونے لگا۔ مبالغہ آرائی اور خارجی مضامین پر زور دیا گیا۔ نسوانیت کا غلبہ رہا۔ ریختی کی ایجاد ہوئی۔ تصنع بناوٹ اور خارجیت کا دور دورہ رہا۔

دوسری طرف شعرا نے لکھنؤ نے زبان و بیان کو سنوارا، ثقیل الفاظ کو زبان سے خارج کیا۔ شیریں اور لطیف الفاظ کا استعمال کیا۔ اس کے علاوہ شعری صنعتوں کا استعمال کثرت سے ملتا ہے تخیل کی بلند پروازی، تشبیہات و استعارات کی ندرت، الفاظ و معنی کی باریکیاں بخوبی ملتی ہیں۔

لکھنؤ میں غزل، مثنوی اور مرثیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ غزل میں ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔ مرثیے کی ترقی نے اخلاقی مضامین کو جگہ دی۔ زبان کو نئی جلا ملی۔ انیس و دہیر نے اس صنفِ مرثیہ کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ مثنوی نگاری میں میر حسن اور دیانکر نسیم نے خوب نام کمایا۔ انھوں نے ”سحر البیان“ اور ”گلزارِ نسیم“ لکھ کر لکھنوی تہذیب و معاشرت، رسوم و عقائد اور زبان و بیان کے بہترین نمونے پیش کئے۔ یہ دونوں اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں۔

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ جب دہلی کی بساط پٹی تو اس وقت کس بادشاہ کا زمانہ تھا؟
- ۲۔ واجد علی شاہ کہاں کے نواب تھے؟
- ۳۔ ناسخ کا پورا نام کیا ہے؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ دبستان لکھنؤ کا باقاعدہ آغاز کن شعرا کے زمانے سے ہوتا ہے؟
- ۵۔ لکھنؤ میں اصلاح زبان کے لیے کن شعرا کے نام آتے ہیں؟
- ۶۔ ناسخ کے دو شاگردوں کے نام بتائیے۔

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ دبستان لکھنؤ کی شعری خدمات پر تبصرہ کیجیے۔
- ۸۔ دبستان لکھنؤ کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

ڈاکٹر قائد علی خاں

فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

اردو کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج نے بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں قائم کیا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو اس کالج کا صدر بنایا گیا۔ اس کالج کے قیام کا اصل مقصد نووارد انگریزوں کو ہندوستانی زبان (اردو) سے واقف کرانا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے اکثر و بیشتر حصوں میں جو زبان بولی جا رہی تھی وہ اردو زبان تھی۔ علمی و ادبی زبان فارسی تھی۔ ادبی ذخیرہ یا تو مذہبی رسائل تھے یا مشکل زبان میں لکھی گئی کتابیں تھیں۔ جان گلکرسٹ نے تمام ہندوستان سے قابل ماہرین زبان کو جمع کیا اور ان سے تصنیف و تالیف کا کام کروایا گیا۔ فارسی سے اردو میں تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔ سادہ اور سلیس زبان پر زور دیا گیا۔ کچھ ہی عرصہ میں اردو میں نثری کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے نامور ادیبوں میں میرامن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، بہادر علی حسینی، مظہر علی والا، مرزا کاظم علی جواں، نہال چند لاہوری شامل ہیں، جن کی علمی و ادبی کاوشوں نے فورٹ ولیم کالج کا نام تاریخ میں درج کروایا۔

جان گلکرسٹ:

۱۸۰۰ء میں گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے۔ وہ اردو زبان کے بڑے حمایتی اور خیر خواہ تھے، اس ادارے میں جب باقاعدہ اردو کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے ملک کے کئی قابل لوگوں کو مدرس مقرر کیا، ساتھ ہی تصنیف و تالیف کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کیا، ان

کتابوں کو چھاپنے کے لیے اردو ٹائپ کا ایک مطبع بھی قائم کیا، انہوں نے خود بھی بعض کتابیں تصنیف کیں، جیسے ہندوستانی انگریزی لغت، ہندوستانی علم اللسان، اردو صرف و نحو، رہنمائے زبانِ اردو، قصص مشرقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

میرامن:

میرامن دہلی کے رہنے والے تھے، ان کی ادبی زندگی کا آغاز کلکتہ پہنچ کر فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے کے بعد شروع ہوا، اپنے دوست بہادر علی حسینی کے توسط سے کالج میں ملازمت حاصل کی، فارسی کتابوں کے آسان اور عام فہم زبان میں ترجمہ کا کام کیا۔ میرامن نے ”باغ و بہار“ لکھی جو فارسی ’قصہ چہار درویش‘ کا اردو ترجمہ ہے، یہ کتاب اپنی سادہ، سلیس اور عام فہم زبان کی وجہ سے بے حد مقبول ہوئی۔ باغ و بہار کو نہ صرف اردو میں مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔ ان کی دوسری تصنیف ’گنج خوبی‘ ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی ’اخلاقِ محسنی‘ کا ترجمہ ہے۔

حیدر بخش حیدری:

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ادیبوں میں آپکا شمار ہوتا ہے۔ آپ دہلی کے رہنے والے تھے پہلے بنارس پھر کلکتہ پہنچے اور فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو گئے۔ اس کالج کے مصنفین میں سب سے زیادہ کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔ حیدری کی تصنیفات میں ’قصہ مہر و ماہ‘، ’قصہ لیلیٰ مجنوں‘، ’طوطا کہانی‘، ’آرائشِ محفل‘، ’ہفت پیکر‘، ’تاریخِ نادری‘، ’گلِ مغفرت‘، ’گلزارِ دانش‘، ’گلشنِ ہند‘ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے فارسی قصہ ’حاتم طائی‘ کا ترجمہ ’آرائشِ محفل‘ کے نام سے کیا۔ ان کی دوسری کتاب ’طوطا کہانی‘ ہے جو سید محمد قادری کے فارسی ’طوطی نامہ‘ کا ترجمہ ہے۔ اس میں سلیس اور سادہ زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ ’آرائشِ محفل‘ اور ’طوطا کہانی‘ زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

میر شیر علی افسوس :

شیر علی افسوس کا شمار فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں ہوتا ہے افسوس دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ میر، سودا، درد، انشا مصحفی اور جرأت کا زمانہ تھا۔ آپ کو ان کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا، منشی کی حیثیت سے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کی گلکرسٹ کی فرمائش پر فارسی کی دو کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا 'باغِ اردو' اور 'آرائشِ محفل'۔ 'باغِ اردو' شیخ سعدی کی 'گلستاں' کا اردو ترجمہ ہے اور 'آرائشِ محفل' منشی سبحان رائے کی فارسی تاریخ 'خلاصۃ التواریخ' کا اردو ترجمہ ہے افسوس نہ صرف ادیب بلکہ صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے۔

مرزا علی لطف :

مرزا علی لطف کا فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم میں شمار ہوتا ہے گلکرسٹ کی فرمائش پر اردو شاعروں کا ایک تذکرہ 'گلشنِ ہند' لکھا جو فارسی تذکرہ 'گلزارِ ابراہیم' کا اردو ترجمہ ہے تذکرہ میں صرف شعرا کے حالات ہی نہیں اس دور کا پورا نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

بہادر علی حسینی :

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے والے ادیبوں میں سب سے پہلا نام بہادر علی حسینی کا ہے، انھوں نے 'بے نظیر' اور 'اخلاقِ ہندی' لکھیں۔ حسینی نے میر حسن کی مشہور مثنوی 'سحر البیان' کو نثر میں لکھا اور اس کا نام 'بے نظیر' رکھا۔ 'اخلاقِ ہندی' فارسی سے ترجمہ ہوئی اس کے قصے سنسکرت کی اخلاقی خوبیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

مظہر علی خاں ولا :

فورٹ ولیم کالج میں منشی کے عہدے پر فائز ہوئے، دہلی کے رہنے والے تھے، کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا، ہندی، فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے۔ انھوں نے حسب ذیل رسالت

کتابیں لکھیں، مادھونل کام کندلا، ترجمہ کریمہ، ہفت گلشن، اخلاق ہندی، بیتال پچھسی، تاریخ شیرشاہی، اور جہانگیر نامہ۔

مرزا کاظم علی جواں :

جواں فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے، دہلی کے رہنے والے تھے، دہلی تباہ ہوئی تو لکھنؤ کا رخ کیا، لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ کی سفارش سے کلکتہ پہنچے، وہاں انھوں نے 'شکنتلا ناک'، بارہ ماسہ اور 'تاریخ فرشتہ مرتب کیں۔ آپ نے گلکرسٹ کی فرمائش پر کالی داس کی 'ابھگیان شکنتلم' کا ترجمہ 'شکنتلا ناک' کے نام سے کیا جو بہت مشہور ہوا۔

نہال چندلا ہوری :

نہال چندلا ہوری کا فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں شمار ہوتا ہے۔ گلکرسٹ کی فرمائش پر 'گل بکاؤلی' کے فارسی قصے کو آپ نے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا نام 'مذہب عشق' رکھا اس کی شہرت و مقبولیت کو دیکھ کر پنڈت دیاشکر نسیم نے اسے 'گلزار نسیم' کے نام سے نظم کیا۔

فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں کی کوششوں سے تصنیف و تالیف اور تراجم کا جو سلسلہ شروع ہوا اس سے اردو نثر کو کافی فروغ حاصل ہوا اور ساتھ ہی مشکل پسندی اور مقفی و مسجع عبارت آرائی کی جگہ سادہ سلیس زبان پر زور دیا جانے لگا۔

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ فورٹ ولیم کالج کس سن میں قائم ہوا؟
- ۲۔ میرامن کہاں کے رہنے والے تھے؟
- ۳۔ 'باغ و بہار' کے مصنف کون ہیں؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ حیدر بخش حیدری کی چند تصانیف کے نام لکھیے۔
- ۵۔ جان گلکرسٹ کون تھے؟ ان کی کسی ایک تصنیف کا نام بتائیے۔
- ۶۔ 'مذہبِ عشق' کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
- ۸۔ فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ کی علمی کوششوں پر روشنی ڈالیے۔

علی گڑھ تحریک

سر سید تحریک ایک علمی و ادبی تحریک تھی جس کے بانی سر سید احمد خاں تھے یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا زوال ہو رہا تھا، انگریزی حکومت غالب آ رہی تھی اور ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔ یہیں سے مسلمانوں کی بربادی کا سلسلہ شروع ہوا۔ دراصل اس کی ذمہ دار اس قوم کی پستی، بے عملی، جہالت، نا عاقبت اندیشی تھی جس نے انہیں تباہی کے گڑھے میں ڈال دیا۔ ان حالات میں ایک رہنما اور مصلح قوم کی ضرورت محسوس ہوئی جو مسلم قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرے سر سید نے یہ کام کر دکھایا۔ ان کے دل میں قوم کا درد تھا، انہوں نے سوتوں کو جھوڑا ان کا کھویا ہوا وقار واپس دلایا، فکر و عمل کی تلقین کی اور اپنی اصلاحی کوششوں سے ان کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ سر سید کی قومی بھلائی کے جذبے نے مذہب، ادب، سیاست، تعلیم، معاشرت غرض ہندوستانی مسلمانوں کے سبھی مسائل پر توجہ کی۔ آخر سر سید کی محنت رنگ لائی، مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی اور قوم ترقی کے راستے پر گامزن ہوئی۔ سر سید کی ان کوششوں کو سر سید تحریک کہا گیا چونکہ اس کا مرکز علی گڑھ تھا اس لیے علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سر سید نے جدید تعلیم کو مسلمانوں کی ترقی کا واحد ذریعہ بتایا، انہوں نے مسلمانوں میں تعلیم کا ذوق پیدا کیا۔ وہ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کی، انگلستان کا سفر کیا وہاں کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے تعلیمی نظام کا بغور جائزہ لیا۔ وہاں سے لوٹ کر ۱۸۵۷ء میں علی گڑھ میں مجٹرن اینگلو اورینٹل کالج (ایم۔ اے۔ او۔ کالج) کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۲۰ء میں اس کالج نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لیا۔ اب اسے علی گڑھ یونیورسٹی کے نام سے جانا

جاتا ہے۔

سائنٹیفک سوسائٹی ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد مغربی علوم کی مختلف کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرانا تھا تا کہ جدید علوم سے مسلمان واقفیت حاصل کریں۔ اس کے علاوہ 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا گیا۔

سر سید چاہتے تھے کہ ملک کے ہر شہر اور قصبے میں ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسے قائم کیے جائیں۔ اسی مقصد کے تحت سر سید نے ۱۸۸۶ء میں ممٹن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، بعد میں اس ادارے کا نام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہوا۔

سر سید نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لہذا 'تاریخ سرکشی بجنور' (۱۸۵۸ء) میں اس کی تفصیل موجود ہے اور ۱۸۵۹ء میں 'اسباب بغاوت ہند' لکھ کر انہوں نے یہ واضح کیا کہ سرکار کی غلط پالیسی ہی اس کی ذمہ دار تھی۔ بعد میں ۱۸۶۰ء میں 'لائل ممٹن آف انڈیا' میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمان انگریزی سرکار کے بدخواہ نہیں۔ ایک انگریز ولیم میور نے 'لائل آف ممٹن' لکھی جس میں سیرت پاک پر غلط بیانی سے کام لیا گیا تھا جس کی تردید میں انہوں نے 'خطبات احمدیہ' لکھی۔

انگلینڈ کے دوران سفر انہوں نے اسٹیل اور ایڈیسن کے رسالے 'ٹیلر' اور 'سپیکٹیر' کا مطالعہ کیا۔ جو انہوں نے معاشرے کی اصلاح کی غرض سے لکھے تھے۔ ہندوستان واپس آ کر سر سید نے ۱۸۷۰ء میں رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا۔ اس رسالے میں علمی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی موضوعات پر مضامین لکھے گئے۔ سر سید کے تعلیمی و اصلاحی مشن میں ان کے رفقا خواجہ الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، چراغ علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور مولوی ذکا اللہ کے نام شامل ہیں۔ جنہوں نے سر سید کے ساتھ قدم سے قدم ملایا اور اردو ادب کے مختلف پہلوؤں کو نئے انداز میں پیش

کیا۔ ان لوگوں نے ”تہذیب الاخلاق“ میں مضامین ہی نہیں لکھے بلکہ بیش قیمتی تصانیف بھی یادگار چھوڑی ہیں۔

محمد حسین آزاد اور حالی نے نیچرل شاعری کو فروغ دیا۔ حالی نے سرسید کی فرمائش پر ’مسدس مدوجزرا سلام‘ لکھی۔ اس کے علاوہ حالی نے ’مقدمہ شعر و شاعری‘، ’حیاتِ سعدی‘، ’حیاتِ جاوید‘، ’یادگار غالب‘ بھی تصنیف کیں۔ محمد حسین آزاد نے ’آب حیات‘، ’نیرنگ خیال‘، ’دربارِ اکبری‘ وغیرہ تصانیف لکھ کر ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔

شبلی کی تصانیف میں ’شعر العجم‘، ’الفاروق‘، ’الممامون‘، ’موازنہ انیس و دسیر‘ وغیرہ یادگار ہیں۔ اسی طرح نذیر احمد نے ’مرآة العروس‘، ’بنات العرش‘، ’توبتہ النصوح‘، ’فسانہ بتلا‘، ’ایامی‘ اور ’رویائے صادقہ‘ لکھ کر ناول کی صنف کو مقبول بنایا۔

غرض سرسید کے مضامین میں ادب، مذہب، سیاست، تعلیم معاشرت، اقتصادیات سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ کے رفقاء میں حالی، شبلی، محمد حسین آزاد نے اردو نثر، تنقید، تاریخ، سوانح کو بلند مقام پر پہنچایا۔ مقالہ نگاری میں محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی وغیرہ بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ سرسید نے اردو نثر کو لفظی، تصنیع، عبارت آرائی سے نجات دلائی اور مدعا نویسی اور استدلالی نثر پر زور دیا، زبان صاف اور سادہ استعمال کی۔ سرسید کا کہنا تھا کہ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔

مشقی سوالات

مختصر ترین سوالات:

- ۱۔ سرسید تحریک کے بانی کا نام کیا ہے؟
- ۲۔ مہٹن اینگلو اور نیٹل کالج کا قیام کب عمل میں آیا؟
- ۳۔ سرسید نے کون سا رسالہ نکالا تھا؟

مختصر سوالات:

- ۴۔ سرسید کے رفقاء کے نام لکھیے۔
- ۵۔ سرسید کی چند اہم تصانیف کے نام بتائیے۔
- ۶۔ ’مسدس مدوجزرا سلام‘ کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

تفصیلی سوالات:

- ۷۔ علی گڑھ تحریک سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
- ۸۔ سرسید کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔